

..... اور ایک بُت شکن پیدا ہوا

(حصہ سوم، حصہ چہارم)

(سلطان محمود غزنوی کے جہاد اور جاسوسوں کی جذباتی اور واقعاتی داستان)



عنایت اللہ

.... اور ایک بُت شکن پیدا ہوا

جلد دوم

(تیسرا اور آخری حصہ)

سلطان محمود غزنوی کے جہاد اور جاسوسوں کی جذباتی اور واقعاتی کہانیاں

عنایت اللہ

علم و عرفان پبلشرز

34 - اردو بازار، لاہور، فون: 7232336 فکس: 7352332
www.ilmoirfanpublishers.com, E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com

جملہ حقوق محفوظ ہیں

فہرست

۷

۴۰

۸۳

۱۳۹

۱۶۵

قتل، قنوج اور ضربِ کلیم
خدا جودل میں اتر گیا
بلا ساغون کی سکن تلاش
دیوتا نے پنڈت کو نگل لیا
غزنی کی آبرو

نام کتاب	اور ایک بُت شکن پیدا ہوا (جلد سوئم، جلد چہارم)
مصنف	عتایت اللہ
ہائر	گلزار احمد
مطبع	علم و عرفان پبلشرز، لاہور
سرورق	زابدہ لوید پرنٹرز، لاہور
سن اشاعت	نضیل کھانی
قیمت	جون 2008ء
	240/- روپے

علم و عرفان پبلشرز

34۔ اردو بازار، لاہور فون: 7232336-7352332

سیونٹھ سکائی پبلیکیشنز

غزنی سٹریٹ المہ مارکیٹ 40۔ اردو بازار، لاہور
فون: 7223584، موبائل 0300-4125230

قتل، قنوج اور ضربِ کلیم

غزنی کا شہر آج دیوین اور لغمان وطن پرستوں کا میدانِ جنگ بنا ہوا ہے۔ افغانستان کی فوج کے انسداد سپاہی فوج سے جھگڑے ہو کر مجاہدین کے ساتھ مل رہے ہیں۔ روسی ٹینک افغانستان کے دیگر شہروں کی طرح غزنی میں بھی دھناتے پھرتے ہیں۔ رفا سے روسی کاپیٹر لگ برساتے ہیں۔ اگر افغانستان نے غزنی کی عظمت کو یاد رکھا تو وہ روسیوں کے ہم آکھار کر ہی دم لیں گے۔ غزنی کی عظمت صرف اس سے نہیں بھگی کہ وہاں ایک بُت شکن پیدا اور دفن ہوا تھا بلکہ اس شہر کی عظمت کے کچھ اور نشان بھی ہیں جن میں ایک کچھ ہے محمود غزنوی نے اس مسجد کا نام عروسِ فلک رکھا تھا۔ اُس نے یہ مسجد تھکر کی فتح کی یاد گار کے طور پر تعمیر کرائی تھی۔ غزنی والے اس فتح پر جتنا بھی ناز کرتے، کم تھا۔ مستحضر ہندوؤں کا ویسا ہی مقدس شہر ہے جیسے ہمارے لیے سر اور مدینہ ہے۔ یہ ہری کرشن ہمارا ج کی جائے پیدائش ہے اور یہاں بے شمار مندر اور بے عرقی بُت تھے۔ محمود غزنوی جب مستحضر اکا بُت خانہ توڑ کر واپس گیا تو اُس نے غزنی میں سنگِ مہر کی ایسی سج تو میر کرنے کا حکم دیا جو حسنِ تعمیر میں یکساں ہو۔

دور دور سے متاثر ہائے گئے جنہوں نے محمود غزنوی کی کفیل اور تصور سے زیادہ حسین جامع مسجد تعمیر کر دی۔ محمود نے اس کی چھت اور دیواروں میں جو بیل بوٹے کھدوائے، ان میں سونا اور چاندی بکھلا کر ڈالا۔ سجد کے اندیش قیامتِ قائم بچھائے۔

سلطان محمود غزنوی کے دور کی تاریخ ساز اور دلولہ انگیز کمانیوں کا تیسرا مجموعہ بعنوان ... اور ایک بُت شکن پیدا ہوا۔ پیش کیا جا رہا ہے۔ اس میں پانچ کمائیاں شامل کی گئی ہیں جو آپ کو اُس دور میں سے جاتیں گی جب ہندوستان کے سلطانوں اور بادوں میں حق اور باطل کی تلواریں نکل رہی تھیں اور بُت خانوں میں اذانیں گونج رہی تھیں۔ بُتوں کے پتھر سے بنے ٹکڑوں کو غزنی کے گھوڑے دھڑ رہے تھے۔ میں اس سلسلے کی پہلی جلد میں اُس بے انصافی اور دھاندلی کا ذکر تفصیل سے کر چکا ہوں جو سلطان محمود غزنوی کے جہاد کی تاریخ کے ساتھ ہندو تاریخ نویسوں نے کی ہے۔ ایک دو مسلمان تاریخ نویسوں نے بھی ہندوؤں کا اثر قبول کر کے تاریخِ اسلام کے اس بُت شکن کو ڈاکو اور لٹیئر کہا اور یہ ثابت کرنے کی نہ موم کوشش کی ہے کہ ہندوستان پر سلطان محمود غزنوی کے حملے جہاد نہیں تھا۔ حقیقت اُن کمائیوں میں جتنی ہے جو غیر جانبدار تاریخ دانوں نے اُس دور کے مودخول کے حوالوں سے لکھی ہیں۔ یونودیوں اور نصرانیوں کی طرح ہندوؤں نے بھی غزنی سے آنے والے حق کے طرفانوں اور بگڑوں کو رد کئے اور ان کی شدت کو ختم کرنے کے لیے اپنی حسین جہل بیٹیوں کو استعمال کیا تھا کہ ہندوستان کا حق اور عبادی بُت شکنوں کے عزم کو مستزحل نہ کر سکی۔ ہندو لوگوں کے حق جوانی اور عبادی نے اور شکست خورہ راجوں اور ساراجوں کی درپردہ اسلام کشش سرگرمیوں نے ان کمائیوں کو جنم دیا ہے جو میں آپ کو سنار ہوں ہندوؤں اور یونودیوں کی اسلام کش سرگرمیاں آج بھی نہ صرف جاری ہیں بلکہ پہلے سے زیادہ دلکش، طلبہ ماتی اور تباہ کن ہو گئی ہیں۔ ہندوؤں نے سلطان محمود غزنوی کے جذبہ حریت کو مسخ کرنے کی پوری کوشش اس لیے کی ہے کہ آج کے مسلمان نوجوانوں میں غزنوی کا جذبہ پیدا نہ ہو۔

میں نے پاکستانی نوجوانوں میں غزنی کے بُت شکن کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے اُس دور کی تاریخ کو چھان مارا اور یہ کمائیاں اخذ کی ہیں۔ ان کمائیوں میں آپ کو تعریجِ صبح کا خاصا سامان بھی ملے گا جو تعریج کے ساتھ ساتھ ایمان کو تر و تازہ کر دے گا۔

عنایتِ انور

میناروں کے کھنڈوں پر سونا چڑھایا۔ پھر اس کے قریب ایک یونیورسٹی کا سنگ بنیاد رکھا جس میں کتب خانوں کے انبار لگائیے گئے۔ کتابیں مختلف زبانوں کی تھیں۔ یونیورسٹی کا عجائب گھر بھی بنایا جس میں نادریا رکھیں۔ یہ مسجد اور یونیورسٹی علم و فن کا مرکز بن گئی۔ محمود نے یونیورسٹی کے علما، اساتذہ اور طلباء کے لیے کثیر رقم الگ کر دی۔

ہزارے جب اپنے سلطان کا فوق دیکھا تو انہوں نے اپنے لیے نہایت خوبصورت مکان اور دلکش مسجدیں تعمیر کرنی شروع کر دیں۔ تھوڑے ہی عرصے میں غزنی خوبصورت مکانات، باغوں، مصنوعی چشموں اور حسین مسجدوں کا شہر بن گیا۔ آج غزنی ان تعمیرات کے کھنڈوں کا شہر بن گیا ہے۔

جن فتوحات کی یاد میں محمود غزنوی نے ساڑھے نو سو سال پہلے یہ جامع مسجد اور یونیورسٹی تعمیر کی تھی، وہ فتوحات اُسے آسانی سے حاصل نہیں ہوئی تھیں۔ اس مسجد اور یونیورسٹی کی بنیادوں میں غزنی کے اُن ہزاروں مجاہدین کا خون شامل تھا جن کی لاشیں غزنی ڈالیں نہیں لائی جا سکی تھیں۔ بلند شہر، مستقر، مہابن اور قنوج کے علاقے میں گنگا اور جند کے کنارے اُن شہیدوں کی قبروں کے نشان تو مٹ چکے ہیں، سڑھے نو سو برسوں میں ان کی ہڈیاں بھی وٹاں نہیں رہیں۔ انہوں نے جس طرح مستقر اور اس کے بعد قنوج فتح کیا تھا، اس کے چھ لیک، ولولہ انگیز اور جنات کو ہلانے والے داستان ہے۔

۱۰۱۸ء کے آخر میں محمود غزنوی بلند شہر سے مستر تک گولے کی طرح پھر گیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں تو اس کی پیش قدمی اور فتوحات کی شکل گولے کی سی بنتی ہے۔ اُسے اس ایک ہی حملے میں کسی بار دریا سے گنگا اور جہاں عبور کر کے بڑے جگ کے بھرتہرت کا اظہار کرتے ہیں کہ اپنے وطن سے تین ماہ کی مسافت یعنی دہر آ کر اتنی رعایاں لڑنا اور ہر لڑائی میں کامیابی حاصل کرنا، معمولی دماغ اور جنگی فہم و فراست کے جرنیل کے بس کی بات نہیں تھی۔

مستقر بہت بڑا شہر تھا جسے وہ مار چکا تھا۔ ہندوستان کے اتنے بڑے بُت خانے میں اذانیں گونج رہی تھیں۔ سلطان نے قنوج کو مستقر میں آرام اور تنظیم میں رد بدل کے لیے روک لیا۔ اُسے اب قنوج کی طرف پیش قدمی کرنی تھی۔ قنوج کے متعلق اسے بتایا گیا

تھا کہ اس کی فتح آسان نہیں ہوگی۔ ہمارا قنوج کو دوسرے ہمارا جوں کی نگاہ میں احترام حاصل تھا۔ وہ دانشمند تھا۔ یہی وجہ تھی کہ محمود غزنوی نے قنوج پر حملے سے پہلے قنوج کو آرام دینے اور دمتوں کو از سر نو تنظیم کرنے کی ضرورت محسوس کی تھی۔ اُس نے قنوج اور گرد و نواح میں اپنے جاسوس بھیج دیئے تھے۔ اُسے جو معلومات دی گئی تھیں، ان کے مطابق قنوج کے راستے میں دو اور ریاستیں تھیں جن کے حکمران ہمارا بے نیس راستے تھے۔ ان میں ایک راستے چند تھا اور دوسرا چاندل بھور۔ چھوٹے چھوٹے اور رستے بھی تھے اور یہ سب ہمارا قنوج راجا پال کے اتحادی تھے۔

جاسوسوں نے جن مقامی باشندوں کو مشرف (ایکٹ) بنایا تھا، ان کی زبانی پتہ چلا تھا کہ لامبور کا ہمارا جہیم پال بندہ بھی اس خطے میں کہیں موجود ہے اور وہ سیال کے ہمارا جوں اور راجوں کو محمود غزنوی کے خلاف متحد کرتا پھر رہا ہے۔ وہ خود محمود غزنوی کے سامنے نہیں آ سکتا تھا کیونکہ وہ سلطان کا باج گزار تھا اور اُس نے سلطان کے ساتھ جنگ نہ کرنے اور غزنی کی قنوج کو ہر طرح کی مدد دینے کا معاہدہ کر رکھا تھا۔ سلطان مسد نے اسے دھونڈنے اور اگر ممکن ہو سکے تو پکڑ لانے کے لیے آدمی بھیج رکھے تھے مگر اُس کا کہیں سراغ نہیں مل رہا تھا۔

قنوج مستقر سے ڈیڑھ سو میل دور دیا ہے گنگا کے دائیں کنارے پر واقع ہے اور مستقر اور دیا کے درمیان گنگا کے دائیں کنارے پر اس طرح محمود غزنوی کو دو دریا عبور کرنے تھے مگر راستے میں جو طے اور رائے قلعوں میں بیٹھے تھے، انہیں نہ تیغ کرنا ضروری تھا، در نہ قنوج کو محاصرے میں لینے کی صورت میں یہ سب سلطان پر عقب سے حملہ کر دیتے۔ سلطان پیش قدمی جلدی کرنا بہتر سمجھتا تھا مگر قنوج کا دفاع زیادہ مضبوط نہ ہونے پائے۔

راتے میں جہاں کے بائیں کنارے پر منج نام کا ایک مضبوط قلعہ اور چھوٹی سی ریاست تھی۔ اسے بھادون بھی کہتے ہیں۔ اُس زمانے میں یہ برہمنوں کا قلعہ کے نام سے مشہور تھا۔ قنوج اور منج کا درمیانی فاصلہ صرف تیس میل تھا۔ منج ہندو راجپوتوں کا گڑھ تھا۔ یہ لوگ غیر متند اور جنگ و جدل کے شیدائی تھے۔ ان کی عورتیں بھی بہادر اور

برقرانی دینے والی تھیں۔ سارا بدستور کوشنج کے راجپوتوں پر اٹھا دیا تھا۔ اُس نے ان کے ساتھ دوستی اور جنگی تعاون کا معاہدہ کر رکھا تھا۔

ایک دھڑک کے لوگ دریا سے جہاں میں بنارہے تھے۔ مردوں سے دُور بھاگتے بھی دریا میں اُتر جاتی تھیں۔ بندوؤں کے لیے صبح دریا میں ہینا ناخدیسی فریضہ ہے۔

سُج کا قلعہ دریا کے طین کنارے پر واقع تھا۔ اچانک ٹورٹوں کی چیخ دیکھ کر بلند ہوئی اور عورتیں کنارے کی طرف بھاگیں۔ مردوڑے آئے۔ وہ سمجھے کہ دریا سے شاید مگر کچھ یا کوئی اور آفت نکلے ہے مگر وہاں کچھ اور ہی نظر آیا۔ دریا میں لاشیں بہتی آرہی تھیں اور پانی کا رنگ بھی بدلا ہوا تھا۔ پہلے چند ایک لاشیں نظر آئیں پھر دریا جیسے لاشوں کا دریا بن گیا ہو۔ دریا پر جو بندت اور دیگر مذہب پرست لوگ تھے، وہ ہاتھ جوڑ کر دوزانو بیٹھ گئے اُٹھ گھبراہٹ لگے۔ اُن کے جسم کا نپ رہے تھے اور ان کے بھجن بھی کاپب رہے تھے۔

قلعے کی دیواروں پر کھڑے سنتریوں نے دیکھا تو ان کی بھی حالت فیر ہونے لگی۔ یہ راجپوت کسی سے ڈرنے والے نہیں تھے لیکن وہ زندہ لوگوں سے نہیں ڈرتے تھے مرنے والی زیادہ لاشیں کسی فوجی آفت کا پتہ دیتی تھیں۔ دریا سے جو بندت بھاگ آئے تھے انہوں نے مندر کے گھڑیاں اور ننگے بھانے شروع کر دیے۔ سارے شہر میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ رائے چند کو اطلاع ملی تو وہ دوڑتا پلے کی دیوار پر جا چڑھا۔ اُس کے ساتھ اُس کے فوجی افسر اور درباری تھے۔

”جانتے ہو۔ کیا ہے؟“ اُس نے سب سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”یہ مستحضر اور مسابن کی لاشیں ہیں۔ لیکن انہوں نے یہ خبر نہیں سنی تھی کہ غزنی کے مسلمانوں نے مستحضر پر قبضہ کر کے وہاں کے تمام مند اجاڑ ڈالے ہیں؟“ قلعے کی دیوار سے اُسے وہ لوگ شہر کی جانب دوڑتے نظر آ رہے تھے جو لاشوں کو دیکھ کر دریا سے بھاگے آ رہے تھے۔ رائے چند نے کہا ”دیکھو ان بزدلوں کو۔ لاشوں سے ڈر کر بھاگے آ رہے ہیں۔“

میں نے معلوم نہیں کریں بزدلی دکھائی تو ہم سب کی لاشیں اسی طرح دریا میں بہیں گی۔

اب ہماری عورتیں مسلمانوں کے قبضے میں ہو گئی۔

مند کے گھنٹوں، گھڑیاں اور کھنڈوں کی آوازیں اور زیادہ بلند ہو گئی تھیں اور اب لوگ گلیوں میں بھی ہرے رام، ہرے کشن کا بلند ورد کرنے لگے تھے۔ عورتیں بھی گلیوں میں نکل آئی تھیں۔ شہر کی یہ آوازیں بڑی دھواؤں تھیں۔ رائے چند کے چہرے کا رنگ بدلتے لگا۔ آخر وہ پھٹ کر بولا۔ ”بند کرو یہ ننگے اور گھڑیاں۔ شہر میں یہ کیا ماتم ہو رہا ہے۔ راجپوت کسی کی لاش پر رو رہے ہیں۔ بند توں کو یہاں لے آؤ۔“

رائے چند کے محافظ اور سپاہی دوڑ پڑے اور کچھ دیر بعد شہر پر تانا طاری ہو گیا۔ رائے چند نیچے چلا گیا اور اپنے عام کمرے میں جا بیٹھا۔ زیادہ دقت نہیں گزرا تھا کہ دو ہفتہ آگئے اور ان کے ساتھ ہی ایک اور آدمی کو اندر لایا گیا جس کے کپڑے بھیلے ہوئے تھے اور اُس کی سانسیں اکھڑی ہوئی تھیں۔ رائے چند کو بتایا گیا کہ یہ آدمی دریا سے زندہ نکالا گیا ہے۔ کٹری کے ایک ٹہنی کے سہارے تیرتا آ رہا تھا۔ رائے چند نے اُسے کہا کہ وہ سب کو بتائے کہ جن لاشوں کے ساتھ وہ تیرتا آیا ہے وہ کن لوگوں کی ہیں اور کہاں سے آئی ہیں۔

”یہ مسابن کی فوج کی لاشیں ہیں“ اُس نے کہا۔ ”ادھیں مسابن کی فوج کا آدمی ہوں۔ میں بتایا گیا کہ غزنی کی مسلمان فوج تھوڑی سی تھی مگر آج ہے اور اس کا رخ متحرک طرف ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ مسابن کا جنگل کتنا گھنا اور کتنی دُور دور تک پھیلا ہوا ہے۔ ہمارے ہمارا جنگل چند نے تمام فوج اس جنگل میں پھیلا دی یہ بھلاؤں کو دھتورے پر چڑھا دیا۔ ہاتھوں کو ایک طرف کھڑا کر دیا کہ ہم ملتے ہی مسلمانوں کو کھیلنے کے لیے دوڑا دیے جائیں گے مسلمانوں کی فوج کو اسی جنگل سے گزرنا تھا۔ پھر نہیں آپ کو بتائیں سنا کہ کیا ہوا۔ جنگل کے اندر مسلمانوں کی بہت تھوڑی سی فوج آئی۔ ہماری فوج نعرے لگاتے لگی۔ ایک کو بھی نہ جانے دو.... ان کی لاشیں مستحضر کے مندر کے سامنے جلائی گئی۔ جنگل کی تین طرفوں سے جیسے طوفان آ گیا ہو۔ پیچھے سے دایمیں اور بائیں سے مسلمان ہم پر ٹوٹ پڑے۔ جن ہاتھوں کو مسلمانوں پر چھوڑنا تھا، وہ چنگھاڑتے اور ادھر ادھر دوڑ پڑے۔ دھتورے پر ہمارے جو پیراں تھے وہ تیرکھا کھا کر گر گئے۔“

ان کے تیروں سے مسلمان بھی سرے لیکن وہ خود بھی زندہ نہ رہے۔ درختوں سے ان کی لاشیں گر رہی تھیں....

”ہلدی فوج بھاگ اٹھی۔ ہمارے پیچھے مسلمان بغل کو صاف کرتے آ رہے تھے۔ ایسے لگتا تھا جیسے درخت جڑوں سے اکھڑ رہے ہوں۔ آگے جتنا تھا۔ ہلدی فوج جنایں کوڈمٹی۔ زخمی بھی میاں میں اتر گئے۔ مسلمان تیر انداز دریا کے کنارے سے ہم پر تیر بسلنے لگے۔ وہ گھوڑے کنارے کے ساتھ ساتھ دوڑاتے اور ہم پر تیر چلاتے تھے۔ صیاحیں چیخوں اور دواویلوں کے سوا کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ تیروں سے بچنے کے لیے جوڈ کی لگاتے تھے وہ دھوب جاتے تھے۔ تیر اندازوں نے کمی کو دوسرے کنارے پر بھی نہ جانے دیا۔ میں ایک لکڑی کے تختے پر تیر آ آیا ہوں۔ بے شمار آدمی بہت دھڑا کر بھی دیا سے نہٹے کہ مسلمان مار ڈالیں گے۔ یہاں آ کر میں نے باہر آنے کی جرأت کی۔ مجھے معلوم نہیں کہ کہاں میں ہمارے بعد کیا ہوا ہے۔“

”وہ میں بتاتا ہوں۔“ رائے چندا نے گرج کر کہا۔ ”مجھے اطلاع مل چکی ہے۔ ہمارے راج گول چند نے اپنی عورتوں اور بچوں کے ساتھ خودکشی کر لی ہے۔ اُس کے تمام ماتھی مسلمانوں کے پاس ہیں، اور غزنی کے سلطان محمود نے ستھر کا بڑا مندر اور تمام جھوٹے مندر صاف کر دیئے ہیں۔ وہاں کے لوگ اب ننگے اور گھڑیاں نہیں اڑائیں سنتے ہیں۔“

”ہرے رام۔ ہرے رام۔“ دونوں پنڈتوں نے کسا اور بڑا پنڈت بولا۔
”ان پانچ مسلمانوں پر ایسی آفت پڑے گی کہ ان کی بولیاں جلیں، گدیہ اور کتے کھائیں گے۔ کرشن واسدیو کا تھران کے پتوں کو بھی بھسم کر دے گا۔ مداراج! ہر ہمدیو بہت بڑی قربانی مانگتے ہیں۔ اگر آپ قہر سے بچنا چاہتے ہیں تو ایک کنواری کی جان کی قربانی دینی پڑے گی۔ میں آپ کو حساب کر کے بتاؤں گا کہ اور کیا کچھ کرنا پڑے گا۔ آکاش پر ستاروں کی گردش کے راستے بدلے بدلے سے ہیں۔ یہ میں آپ کو ابھی بتا دیتا ہوں۔ یہ پچھ چند ماں کا بے گھما پوربا، پھاگن، بہست چتر استری پتھر ہیں چند ماں جل، برجنوں سے گزرتا ہے۔ یہ سسے راج یا ٹھ کے بے بہت بڑا

ہے۔ سورگ کے دروازے کھل گئے ہیں۔ بلش مکھیوں کی طرح برس گئے۔ آپ دیکھ رہے ہیں۔ اس میں ہر کی کشن واسدیو کا کردہ شامل ہو گیا ہے۔ یہ سسے پن اور پارتھنا کا ہے.... ہم آپ کی خیم پتری پھر دیکھیں گے۔ اگر بلیدان میں دیر ہوئی تو ہندو دیویاں مسلمانوں کے پتے پیدا کریں گی۔ اپنی دیویوں کی کوکھ کوٹھپھوں کے بچ سے بچانے کے لیے اور انہیں پوتر تر رکھنے کے لیے ہمیں ہمدیو کے چرنوں میں ایک سے زیادہ کنواریوں کا بلیدان دینا ہو گا۔“

رائے چندا کے چہرے کا رنگ بدلتا جا رہا تھا۔ اُس کی گھنٹی منکھیں کا پینے لگی تھیں۔ وہ پنڈتوں کو قہر کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پنڈت ابھی بول رہا تھا کہ رائے چندا پھٹ پڑا۔

”آپ یہ کیا چاہتے ہیں کہ جو کچھ ہو گا مندر میں ہو گا۔“ رائے چندا نے گرج کر کہا۔ ”دو تین کنواریاں آپ کے حوالے کر دی جائیں گی اور آپ انہیں دس پندرہ روز اپنے پاس رکھیں گے پھر ان کی گریزیں کاٹ دیں گے۔ آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ بچہ بچہ باہر نکلے اور غزنی کے شیروں سے انتقام لے؟“

”چھی چھی چھی مبارج! پنڈت نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر کہا۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ دھرم کی یوں ہتیا نہ کریں۔ یہ برہمنوں کا قلعہ ہے اور برہمن بھگوان کے بہت قریب ہوتے ہیں۔ جو ہم جانتے ہیں وہ آپ نہیں جانتے۔ آپ آکاش کے ستاروں کے راستے نہیں روک سکتے۔ خون کا بلیدان....“

”بلیدان۔ بلیدان۔“ رائے چندا نے گرج کر کہا۔ ”خون کی قربانی صرف دو تین کنواریاں نہیں دیں گی۔ راجپوتوں کا بچہ بچہ اپنے خون کی قربانی دے گا۔ راجپوتوں کی ہر ایک کنواری خون کی قربانی دے گی.... اور یاد رکھو پنڈت جی ہمدانج اس قلعے کا نام برہمنوں کا قلعہ ہے لیکن یہ قلعہ راجپوتوں کا ہے۔ راجپوت ایک ہی بات کہتے ہیں.... دشمن کی موت یا اپنی موت.... راجپوت اپنی فتح پر ایسے مذہب کو بھی قربان کر دیا کرتا ہے۔“

”مداراج! پنڈت نے کہا۔ اپنی رعایا پر رحم کریں۔ میں جو کہتا ہوں

سن میں۔ مذہب کی قربانی کی بات نہ کریں۔“

”ہمیں مذہب کی زنجیریں نہ ڈالو۔ رائے چندا نے کہا۔“ راجہ صالح کی بے عزتی ہو رہی ہو، لوگ بھوکے مر رہے ہوں، دنیا فنا ہو رہی ہو، آپ جیسے مذہبی پیشوا اپنا ہی رنگ لاپتے رہتے ہیں۔ آپ کو میدان میں جا کر لڑنا نہیں پڑتا۔ مندر میں بیٹھے آپ کی پیٹ بوجا ہوتی رہتی ہے۔ آپ کو شعلی چٹائی کے لیے کناریاں بھی ملتی رہتی ہیں۔“

”مباراج!۔ پنڈت نے غصے سے کہا۔“ مسٹر کی تباہی کی خبر سن کر اور دریا میں اتنی زیادہ لاشیں سہتی دیکھ کر آپ کا دماغ چل گیا ہے۔ آپ میری نہیں اپنے دھرم کی بے عزتی کر رہے ہیں۔“

”کوئی دھرم کی بات کر رہے ہیں آپ؟“ رائے چندا نے طنز یہ کہا۔ ”کیا آپ نے سنا نہیں کہ بلند شہر کے دس ہزار ہندو اپنے راجہ ہررت سمیت دھرم پر لڑتے مار کر مسلمان ہو گئے ہیں؟ کیا آپ جانتے ہیں انہوں نے اپنا دھرم کیوں چھوڑا ہے؟“

”اپنی جانیں بچانے کے لیے۔ پنڈت نے کہا۔“ وہ بڑوں تھے مسلمانوں کی تلواروں سے ابد قید سے ڈر گئے۔“

”نہیں۔“ رائے چندا نے کہا۔“ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ دیوتاؤں کے بُت اور دیویوں کی مورتیاں نہ اپنے آپ کو پکڑ سکیں نہ کسی راجے کی پر جا کو۔“

وہاں رائے چندا کی جوان بہن شیلاکھاری اور نوجوان بیٹی رادھا بھی سوجو دھکیں اور رادھا کی ماں بھی وہیں تھی۔ شیلاکھاری نے پنڈت سے کہا۔ ”کیا عورت مندر میں پنڈتوں کے ہاتھوں قربان ہونے کے لیے پیدا ہوئی ہے؟“

”اب کسی لڑکی کی جان کی قربانی نہیں دی جائے گی۔“ رائے چندا کی لڑکی لکشی نے کہا۔ ”اگر آپ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں نے جو تباہی پجائی ہے وہ دیوتاؤں کا قہر ہے تو ہم اس قہر کا مقابلہ کریں گے۔“

دونوں پنڈت غصے میں کچھ بڑبڑاتے چلے گئے۔

رائے چندا کی بہن شیلانے اسے کہا۔ ”بھیا! کیا آپ نے کبھی سوچا ہے کہ غزنی کے سلطان محمود کو کئی طریقے سے قتل کر دیا جائے تو اس کے آئے دن کے جتن ختم ہو سکتے ہیں؟“

”ہمیں بہت کچھ سوچنا ہے سیری بہن!۔“ رائے چندا نے کہا۔ ”ہمارے اہتمام کا وقت آ رہا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ محمود غزنوی کو جنگ میں قتل کرنا آسان نہیں اور اسے دھوکے سے قتل کرنا بھی مشکل ہے۔ پھر بھی میں سوچوں گا۔ سب سے پہلے ہمیں دامراج قنوج کے پاس چلنا ہے۔ غزنی کا یہ سلطان مسٹر ایں نہیں بیٹھا رہے گا نہ وہاں سے ہی واپس جائے گا۔“

اُس نے حکم دیا کہ قنوج کو روانگی کا انتظام کیا جائے۔ فاصلہ صرف ستائیس میل تھا۔ رائے چندا اپنی لڑکی لکشی، بہن شیلانہ اور بیٹی رادھا کے ساتھ اُسی دھرت روانہ ہو گیا۔ اُس کے ساتھ نوجی میٹر اور افسر بھی تھے اور وزیر بھی ساتھ تھا۔ یہ قافلہ شام تک قنوج پہنچ گیا۔

انسی رات رائے چندا نے مباراج قنوج راجپال سے صورت حال کے متعلق بات چیت کر لی۔ راجپال نے اسے کہا۔ ”ہم اکٹھے کھلے میدان میں نہیں لڑ سکتے۔ میرے پاس جہاں اور مسٹر ایں جو آدمی آئے ہیں، انہوں نے بتایا ہے کہ کھلے میدان میں غزنی والوں کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ ہمیں قلعہ بند ہو کر لڑنا پڑے گا۔ کچھ نظر یہ آ رہا ہے کہ محمود آپ کا محاصرہ کرے گا۔ اس کی دراصل نظر قنوج پر ہے۔ اگر اس نے آپ کا محاصرہ کیا تو میں باہر سے محاصرے پر حملے کر کے اُسے کمزور کرنے کی کوشش کروں گا، اور اگر وہ سیدھا قنوج پر آئے تو میں آپ سے توقع رکھوں گا کہ آپ اُس کے عقب پر حملے کر کے رہیں گے۔“

منج کا رتہ چندا بہت بھڑکا ہوا تھا۔ تقریباً تمام موزوں نے لکھا ہے کہ منج کے راجپوت صحیح معنوں میں غیرت مند اور دلیر تھے۔ میدان جنگ میں ان پر تار پناہ آسان نہیں ہوتا تھا۔ ان کی عورتوں کے متعلق لکھا گیا ہے کہ بہت حسین اور غیر معمولی طور پر

جرات مند تھیں اور یہ قوم برائوں سے بہت مختلف تھی۔ رائے چندا کا بیٹا توں اور مذہب کو دھکار دینا اُس کی عاقبت نہیں بلکہ جرات اور بے خوفی کی دلیل تھی۔ رائے چندا کی بہن اندیشی کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ دونوں بہت سی خوبصورت تھیں۔ اُن کے حسن کے چرچے دُور دُور تک ہوتے تھے۔ قنوج کے مہاراجہ راجا پال کا بیٹا کھمن پال ملے چندا کی بہن شیلہ کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا مگر رائے چندا نے شیلہ کی شادی لاہور کے مہاراجہ بھیم پال منڈر کے بھائی ترلوچن پال کے ساتھ کرنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ اگر محمد غزنوی حملہ نہ کر دیتا تو یہ شادی ہو چکی ہوتی۔

رات کو جس وقت مہاراجہ راجا پال اور رائے چندا مسکھڑ کی تباہی اور محمد غزنوی کے متوقع حملے کی باتیں کر رہے تھے اور اُن کے مشیر اور وزیر مقابلے کے منصوبے بنا رہے تھے، اُس وقت راجا پال کا بیٹا کھمن پال محل کے باغ کے اندھیرے کونے میں کھڑا کسی کا انتظار کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد دھڑکتی اس لڑھیرے کونے کی طرف اس طرح جا رہی تھیں جیسے سائے چل رہے ہوں۔ ذرا آگے جا کر سائے زک گئے۔ ایک عورت نے دوسری سے کہا: ”آپ آگے چل جائیں۔ راجا پال جائیں گے۔“

دوسری نے اُس کے ہاتھ میں سونے کا ایک سکہ دیتے ہوئے کہا: ”کئی کو پرہیز چلے کر میں یہاں آئی اور راجا کھمن سے مل تھی۔“

وہ رائے چندا کی بہن شیلہ تھی۔ کھمن پال نے اپنی خاص ملازمہ کو بھیج کر شیلہ کو ایک تاریک گوشے میں بلایا تھا۔

شیلہ اپنی ماں اور کھمنی راہ کو جلتے بغیر چل آئی تھی۔ یہ سب رائے چندا کے ساتھ قنوج آئی تھیں۔

اُسے دیکھ کر کھمن پال آگے بڑھا اور بولا: ”مجھے اُمید نہیں تھی کہ تم آج آ جاؤ گی۔ میں یہاں سے تین سو بیجا مہم تیار ہوں اور تم ہر بار یہی جواب دیتی رہی ہو کہ تیس میری محبت قبول نہیں۔ مجھ میں کیا کمی ہے؟ کیا میں تمہارے قابل نہیں؟

میں جانتا ہوں تمہاری شادی مہاراجہ بھیم پال کے چھوٹے بھائی سے ہو رہی ہے۔ کیا تم یہ فیصلہ بدل نہیں سکتیں؟ کیا تیس وہی راجا پال نہ ہے؟

”تم خوبصورت جوان ہو کھمن!۔“ شیلہ نے کہا۔ ”میرا اپنا کوئی فیصلہ نہیں لیکن اب میں سمجھنے لگی ہوں کہ تم میرے قابل نہیں۔ اُدھر غزنی کے سلطان ہم پر طوفان کی طرح آ رہے ہیں، مسکھڑ اور مہابن کی تباہی کو میں نے جتنا دیکھا ہے، ہزاروں لاشوں کی صورت میں دکھایا ہے، مسکھڑ کے مندر میں سلطان اذانیں دے رہے ہیں، وہ ہری کرشن واسدیو کا بٹ اٹھائے گئے ہیں، بلند شہر کے دس ہزار ہندو مسلمان جو پکے ہیں اور تم مجھے حاصل کرنے کی فکر میں ہو۔ کیا تم میں غیرت نہیں؟ اب سلطان قنوج اور سنج کو فتح کرنے آ رہے ہیں۔“

”مجھ میں سب کچھ ہے۔“ کھمن پال نے کہا۔ ”مگر تمہاری محبت نے مجھے پاگل کر رکھا ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم شادی کا فیصلہ بدل سکتی ہو اور میرے ساتھ شادی کر سکتی ہو۔“

”میں کبھی کو نہیں چاہتی۔“ شیلہ نے کہا۔ ”نہ مہاراجہ بھیم پال کے بھائی کو نہ تمہیں۔ میں اُسی کو چاہئے لگوں گی جس کے ساتھ میری شادی ہو جائے گی۔۔۔ کھمن پال! میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ تیس میرے ساتھ محبت نہیں۔“

تم میرا حسن اور میرا جسم چاہتے ہو۔ چند برسوں بعد جب میرے چہرے پر نوجوانی کے آثار دم پڑنے لگیں گے تو تم ایک اور نوجوان لڑکی لے آؤ گے۔ تمہارے باپ نے اس عمر میں میری عمر کی چہارانی سے شادی کی تھی۔ کہاں ہے چہارانی؟ مسکھڑ کے قلعے میں غزنی کے ایک جاسوس کے ساتھ بھاگتے ہوئے ماری گئی۔

تم اپنے باپ کے نقش قدم پر چلو گے۔ مجھے تم سے محبت نہیں۔“

”مجھ میرے بلانے پر کون آگئی ہو؟ کھمن پال نے پوچھا۔“

”ایک شرط ہے کہ آئی ہوں۔“ شیلہ نے کہا۔ ”اگر پوری کردو تو تمہاری بیوی بن جاؤں گی۔ اگر میرا بھائی نہیں مانے گا تو وعدہ کرتی ہوں کہ تمہارے پاس آ جاؤں گی۔“

”ادریس نے استاد سے پوچھا تھا کہ سلطان عورتیں کسی ہوتی ہیں ایک وہ ہندو راجپوتوں کی عورتوں کی طرح دلیر ہوتی ہیں؛ استاد نے بتایا ہے کہ وطن سے آتی دُور آکر لڑنے اور فتح پانے والے سپاہیوں کی مائیں بغینا دلیر ہوتی ہیں۔ سلطان عورتیں غیر مسلمانوں کے خلاف جنگ میں اپنے بیٹوں کو بھیج کر فخر کرتی ہیں... کچھ نہیں! تم جنہیں لڑا کہہ رہے ہو وہ کسی معمولی قوم کے لوگ نہیں۔ میں ان کا مقابلہ کرنا چاہتی ہوں۔ میں اپنی قوم کو بتانا چاہتی ہوں کہ ہندو راجپوت عورت مسلمان عورت سے زیادہ دلیر ہوتی ہے۔ مجھے تباہی مدد کی ضرورت ہے۔ تم نہیں مانو گے تو میں فوج کے کسی سپاہی کو ساتھ لے لوں گی اور محمود غزنوی کو قتل کروں گی۔ اگر میں زندہ رہی تو اپنا آپ ہمیشہ کے لیے اس سپاہی کے حوالے کر دوں گی۔ کہو، تم محمود کو قتل کر دو گے؟“

”تمہاری خاطر تباری شرط پوری کروں گا۔“

”میری خاطر نہیں“ شیلانے کہا۔ اپنے دھرم اور اپنے دیس کی خاطر.... اگر بیٹھ دکھا جاؤ گے تو میں، میری بھتیجی رادھا اور تمہاری بہنیں مسلمانوں کے دشمنوں میں ہوں گی اور وہ مسلمان بچوں کو جہنم دیں گی۔“

”میں محمود کو قتل کروں گا۔“

”مسکھرائیں“ شیلانے کہا۔ ”وہ مر گیا تو اُس کی فوج بیکار ہو جائے گی۔ وہ مسکھراے آگے نہ آئے۔ تم برہمن ہو۔ برہمن کو اپنے مذہب کا زیادہ خیال ہوتا ہے۔ میری رگوں میں راجپوت کا خون ہے۔ میں تمہیں صاف بتا دیتی ہوں کہ میرے دل میں تہدی وہ محبت نہیں جو تم اپنے دل میں بٹھائے ہوئے ہو لیکن میں وعدہ کرتی ہوں کہ محمود کو قتل کر دو تو ساری عمر تہدی غلام رہوں گی۔“

”اور اگر میں مارا گیا؟“

”تو تہاں جتا پر کھڑی ہو کر زندہ جل جاؤ گی۔“

پچھن اور شیلادہبان کے روکنے کے باوجود اُس کمرے میں داخل ہو گئے جس میں قلعہ کار راجا پال اور منچ کا راستہ چلا اپنے مشیروں اور بڑوں اور فوج کے اعلیٰ افسروں کے ساتھ بیٹھے

”فوزا بتاؤ۔ پچھن پال نے خوش ہو کر کہا۔ جو کہو گی کر دکھاؤں گا۔“

”غزنی کے سلطان کو مسکھرائیں قتل کرنا ہے۔“ شیلانے کہا۔

”مسکھرائیں کیوں؟“ پچھن پال نے کہا۔ ”میں اُسے میدان میں قتل کروں

گا۔ اُس کا سر کاٹ کر تمہارے قدموں میں لار کھوں گا۔“

”پچھن! شیلانے بھیدگی سے کہا۔ ”تم منچ کی ایک راجپوت لڑکی کے ساتھ باتیں کر رہے ہو۔ مجھے بھینانے بتایا ہے کہ مسکھرا کے منہ میں تمام راجوں مہاراجوں نے واسدیلو کے قدموں میں بیٹھ کر تمہیں کھائی تھیں کہ محمود کا سراپا بُت کے قدموں میں رکھیں گے اور اس کے خون سے کرشن مہاراج کے پاؤں دھوئیں گے۔ کہاں ہیں وہ ماہے اور مہاراجے؛ سب بھاگ گئے اور ہندو شہر کے رائے ہر دت نے اپنی دس ہزار فوج کی تلواریں محمود کے قدموں میں رکھ کر اُس کا مذہب قبول کر لیا۔ ہمارے ہری کرشن واسدیلو کے قدموں تلے سے وہ جو ترا نکل گیا ہے جس پر رائے ہندو قوتوں نے کھڑا کیا تھا۔“

”یہ مسلمان لڑے ہیں۔“ پچھن پال نے کہا۔ ”انہیں سونا مند مل سے ملتا ہے، اس لیے مند اُجاڑ جاتے ہیں۔“

”پچھن! ہوش میں آؤ۔“ شیلانے کہا۔ ”بھارت ماما کی عزت کے محافظ صرف راجپوت ہیں اور میں ایک راجپوت کی بیٹی ہوں۔ میرے بھائی نے مجھے جس استاد کے حوالے کیا تھا وہ بہت دانشمند بزرگ ہے۔ میں نے پہلے پہل جب غزنی کے حملوں کے متعلق سنا تھا تو اپنے استاد سے کہا تھا کہ لوگ کہتے ہیں کہ مسلمان لڑے ہیں اور نوٹے آتے ہیں میں نے اب مسکھرا کی تباہی کی خبر سنی تو کبھی اس سے پوچھا تھا کہ مسلمان صرف لوٹے آئے ہیں یا ہمارے علاقوں پر قبضہ کر لیں گے؟.... اُس نے مجھے بتایا ہے کہ محمود غزنوی لڑے نہیں۔ وہ ہمارے مذہب کو ختم کرنے اور اپنا مذہب پھیلانے آیا ہے۔ استاد نے کہا ہے کہ لڑے کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ اگر محمود مذہب کی بھلے دولت سے دلچسپی ہوتی تو راج ہر دت اپنی فوج کے ساتھ اُس کا مذہب قبول نہ کرتا....“

محمود غزنوی کو ہندوستان سے نکلنے کے منصوبے تیار کر رہے تھے۔ راجا پال نے دونوں کو دیکھ کر کہا کہ وہ چلے جائیں۔

”ہم اسی کام کے لیے آئے ہیں جس پر آپ غور کر رہے ہیں۔“ کھمن پال نے کہا۔
بدیتریزی کی سوانی چاہتا ہوں۔ آپ نے جو کچھ بھی سوچا ہے اسے فوراً لگ رکھ دیں۔ کیا آپ نے یہ سوچا ہے کہ غزنی کے سلطان کو سترہ ایسے قتل کیا جاسکتا ہے؟ اس کے قتل سے اس کی ساری فوج آپ کی قیدی ہوگی۔“

سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ راجا پال کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔
”ہم نے ابھی یہ نہیں سوچا۔ رائے چندا نے کہا۔ اس کام کے لیے بہت دیر اور بڑے ہی قلعہ آڈیسل کی ضرورت ہے۔“

”اور ایسے آدمیوں کی ضرورت ہے جو محمود غزنوی کو اپنا ذاتی دشمن سمجھیں۔“ کھمن پال نے کہا۔ کرائے کے قاتل یہ کام نہیں کر سکیں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کرائے کے قاتل دہاں جا کر مسلمانوں سے انعام و اکرام لے لیں اور انہی کے ہو کے رہ جائیں۔ یہ کام کوئی راجا کر سکتا ہے۔“

”ایسا راجا کون ہو سکتا ہے؟“ راجا پال نے پوچھا۔
”وہ آپ کے سامنے کھڑا ہے۔“ کھمن پال نے کہا۔ ”وہ میں ہوں۔“ کھمن پال نے رائے چندا نے ہمارا راجا راجا پال کے کندھے پر ہاتھ مار کر کھمن پال سے کہا۔ ”راجا پال نے اپنے باپ کا سرخڑے اوپکا کر دیا ہے۔ اگر میرا کوئی بیٹا ہوتا تو میں اسے ہمارے ساتھ بھجوا دیتا۔“ کھمن پال نے کہا۔ ”اس کے باپ راجا پال نے کہا۔ اگر تم یہ کام کر سکو تو غزنی کا نائب بھی مرجائے گا اور ہماری فوج کی لاکھلی بھی نہیں ٹوٹے گی۔“

”کیا آپ اس کام کو آسان سمجھتے ہیں؟“ ایک بوڑھے فوجی مشر نے کہا۔ ”کیا آپ اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ یہ راجا مسٹر جائے گا اور غزنی کے سلطان کے دل میں خیر آمد کر اسی طرح واپس آجائے گا جس طرح یہ اب کھڑا ہے؟“

”میں بھارت نامہ پر اپنی جان قربان کرنے کا عہد کر چکا ہوں۔“ کھمن پال نے کہا۔
”اور غزنی کا سلطان یہ عہد کر کے آیا ہے کہ یہاں کسی مسٹر کو اور کسی ہمارا جے کی رہبر صافی

کو سلامت نہیں رہنے دے گا۔“ بوڑھے مشر نے کہا۔ ”ہیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ محمود غزنوی کے بازو بڑے لمبے ہیں۔ ہماری کوئی بات اور کوئی حرکت اس سے پوشیدہ نہیں۔ آپ نے دیکھ لیا ہے کہ جس محافظ کو ہم اپنا سب سے زیادہ قابل اعتماد سمجھتے رہے ہیں اور چراغ محل کے آن رازدوں سے بھی واقف تھا جن سے راجا رنجی واقف نہیں ہوئے، وہ غزنی کا جاسوس تھا۔“

”اس کے باوجود میں اسے قتل کرنے جاؤں گا۔“ کھمن نے کہا۔ ”مجھے ایسے کام کا کوئی تجربہ نہیں۔ مجھے بتاویں کہ ایسے کام کس طرح کئے جاتے ہیں؟“

اس کے باپ ہمارا راجا راجا پال نے اس بوڑھے فوجی اور اپنے وزیر سے کہا کہ کھمن کو محمود غزنوی کے قتل کے لیے تیار کریں۔ اس نے کہا۔ ”میں اپنے بیٹے کو اپنے دھرم اور دھرتی پر قربان کرتا ہوں۔“

”سب سے پہلے ذہن سے یہ خیال نکال دو کہ تمہارا متبادل ڈاکوؤں اور لٹیروں کے ساتھ ہے۔“ دوسرے دن دو تکر بہ کار بوڑھے کھمن پال کو بتا رہے تھے۔ محمود غزنوی صبح صحنوں میں جگمگو ہے اور اس کے سامنے جنگ کا ایک مقصد ہے۔ وہ اپنے ساتھ اپنا مذہب لایا ہے۔ اسے میدان میں شکست دینا آسان نہیں۔ اس کی قتل تک ہمارے ہمارے نہیں پہنچ سکتے۔ اور اس تک اس طرح نہیں پہنچ سکتے کہ اسے جاو اور قتل کر دے صرف ایک بات یاد رکھو۔ مذہب کا کوئی کتنا ہی پابندیوں نہ ہو، وہ ہوتا انسان ہے اور انسان کی سب سے بڑی کمزوری قدرت ہے اور قدرت کی سب سے بڑی کمزوری مرد ہے۔ تم ایک بہروپ میں سترہ جاؤ گے۔“

”بہروپ یہ ہو گا کہ تم قنوج کے جنگلوں میں بسنے والے ایک قبیلے کے سردار ہو قبیلہ جگمگو ہے اور اس کی تعداد چند ہزار سے زیادہ ہے۔ تم کہو گے کہ ہمارا قنوج نے اس قبیلے کو غزنی کی فوج کے خلاف لڑنے کے لیے تیار کر لیا ہے، اگر تم جو اس قبیلے کے سردار ہو مسلمانوں کے خلاف نہیں لڑنا چاہتے۔ اس کی بجائے تم راجا برہوت کی طرح بیٹے تمام قبیلے سمیت مسلمان ہونا چاہتے ہو۔ یاد رکھو راجا راجا پال! ہمیں سلطان محمود تک کوئی

نہیں جانے دے گا۔ تم کہو گے کہ ایک دروازہ کی باتیں ہیں جو تم صرف سلطان کو بتانا چاہتے ہو۔ اس کے باوجود انہیں سلطان سے نہ ملنے دیں تو کہنا سلطان خفیہ طریقے سے قتل ہو جائے گا۔ مجھے اُمید ہے کہ وہ ملاقات کی اجازت دے دیں گے۔“ آپ نے عورت کا ذکر کیا تھا؟ کچھن پال نے کہا۔ ”اُس سے آپ کا مطلب کیا ہے؟“

”تمہارے ساتھ کم از کم دو نہایت خوبصورت اور جوان عورتیں ہونی چاہئیں۔“ استاد نے کہا۔ ”انہیں بیویاں ظاہر کرو گے۔“ اُس نے رازداری سے کہا۔ اگر یہ عورتیں عقل مند ہوں تو سلطان کی فوج کے سالاروں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا سکتی ہیں۔ مجھے یہ بھی توقع ہے کہ سلطان بھی ان عورتوں پر زلفیہ سہو جائے گا۔ اگر وہ انہیں اپنے ساتھ رکھنے کو کہے تو مان جانا۔ ان کے پاس زہر ہونا چاہیے جو وہ اُسے شہریت یا شہزادیں پلا سکتی ہیں۔ ہم تیس ایسی دو جوان لڑکیاں دے دیں گے تیس جنگی قبیلے کے سرداروں جیسا لباس پہنائیں گے۔“

فوجی مشیر اور وزیر نے جو جاسوسی اور جنگ کا تجربہ رکھتا تھا کچھن پال کو ملی تربیت دینی شروع کر دی کہ وہ محمود غزنوی کو کس طرح قتل کرے گا اور وہاں سے کس طرح نکلے گا۔

”ایک عورت میں خود ہوں گی اور دوسری میری بھتیجی رادھا ہوگی۔“ اُسے چننا کی بہن شیلہ کچھن پال سے کہہ رہی تھی۔ کچھن پال اُسے رات کو ملا تھا اور اُسے بتایا تھا کہ اُس کے استادوں نے اُسے کس طرح تیار کیا ہے اور کہا ہے کہ دو جوان اور خوبصورت عورتوں کا ہونا لازمی ہے۔ شیلہ نے رادھا کو بھی بلایا اور اُسے بتایا کہ وہ کیا فیصلہ کر چکی ہے اور کچھن پال کس کام کے لیے جا رہا ہے۔ رادھا نے فوراً رضامندی کا اظہار کر دیا۔ تینوں راتے چننا کے پاس چلے گئے۔ وہ کچھن پال۔

”یہاں لڑکیوں کو مندر میں قربان کر دیا جاتا ہے۔“ رادھا نے کہا۔ آپ

خود کہتے ہیں کہ انسانی قربانی سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ ہم دونوں جو قربانی دیتے جا رہی ہیں، اس سے آپ کو بہت کچھ حاصل ہوگا۔ اگر کچھن پال کے ساتھ کوئی اور عورتیں گئیں تو وہ اسے دھوکہ دے سکتی ہیں۔“

شیلہ اور رادھا کا حُسن اور ان کے جسموں کی دلکشی سارے علاقے میں مشہور تھی۔ ان کی بہادری پر بھی کسی کو شک نہیں تھا۔ ان میں عقل بھی تھی اور وہ محمود غزنوی کے قتل کو اپنا ذاتی فرض سمجھتی تھیں۔ دونوں نے اپنے باپ اور کچھن پال کو بخود کیا کہ وہ اُن کے ساتھ چل جائیں۔

ان سب کے لیے ایسے جنگی قبیلے کا لباس تیار کیا گیا جس کا کوئی وجود نہیں تھا۔ ان کے ساتھ دو تال اعتبار اور دیر فوجیوں کو ان کے نوکروں اور محافظوں کے لباس میں تیار کیا گیا۔ شیلہ اور رادھا کو ایسا لباس پہنایا گیا جس میں اُن کی ٹانگیں گھٹنوں کے اوپر تک اور کندھے اور سینے اور پیٹ کا کچھ حصہ اور بازو ڈنگے تھے۔ اُن کے بال کھول دیئے گئے۔ اس لباس میں اُن کا جسمانی حسن اور دلکشی ایسی نکھری کے دیکھنے والے د اُن سے نظریں نہیں ہٹا سکتے تھے۔ کچھن پال بھی جنگی لباس میں نیم لیا تھا۔ اُس کا گوراجم تو مندر اور بہت خوبصورت لگتا تھا۔

انہیں محمود غزنوی کو سینے کے لیے جو تھنے دیئے گئے ان میں دو ہتھیار، دو چھڑیاں کی کھالیں، اس علاقے کے دوزخہ ہرن اور سونے کا ایک چھوٹا سا بت تھا جس کا اوپر کا دھڑا انسان کا اور باقی دھڑ گھوڑے کا تھا۔ اس کے متعلق انہیں سلطان محمود کو یہ بتانا تھا کہ وہ اس بت کی پوجا کیا کرتے ہیں مگر اب سلمان ہونا چاہتے ہیں۔

رات کو یہ قافہ گھوٹلان پر سوار ہو کر تنوچ سے نکلا۔ انہیں بہانے کے جنگل کے قریب جا کر دیرائے جہا پار کا تھا جو تنوچ سے تقریباً ایک سو کچھن میل دور تھا۔ اُن کے کھانے پینے کا سامان دھچرول پر لدا ہوا تھا۔ انہیں بہانے کے جنگل میں سے گذر کر مسترا تک پہنچنا تھا۔

سلطان محمود غزنوی ابھی متحارب تھا۔ یہ جگہ اُسے بہت ہی اچھی لگی تھی۔ مستحضر انداز
کا شہر تھا۔ مسلمان سپاہی مندروں کو آگ لگا رہے تھے۔ بڑے مند کے صحن میں جو ہندو
کے کرشن بھاراج کی جاتے پیدائش تھا، فوجی نماز باجماعت پڑھتے تھے۔ وہاں کے ہندو
ایسے گئے گئے گندے بھی نہیں تھے کہ اپنے مذہب اور دیوتاؤں کی توہین برداشت کر
لیتے۔ انہوں نے غزنی کے چند ایک فوجیوں کو دھوکہ دے کر قتل کر دیا تھا اور تھری
کاروائیاں بھی کی تھیں۔ سلطان محمود نے حکم دے دیا تھا کہ شہر کو کھنڈر بنا دیا جائے اور ان
انسانی سانپوں کو زندہ رہنے کے قابل نہ رہنے دیا جائے۔ چنانچہ شہر جل رہا تھا اور
محمود غزنوی اپنی فوج کو تھوج کی طرف پیش قدمی کے لیے تیار کر رہا تھا۔ اس کے سامنے فوج
کا خطیب اور بڑے دستوں (ڈویژنوں) کے امام جو غزنی سے ہمیشہ فوج کے ساتھ آیا
کرتے تھے، یہ منے تھے اور ان کے ساتھ اُس کے سالار نائب سالار اور کماندار بھی
تھے۔

”ہم تھوج کی طرف پیش قدمی کرنے والے ہیں۔“ سلطان محمود غزنوی نے کہا۔
آپ کو اس علاقے کا نقشہ دکھانے اور اپنا منصوبہ بتانے سے پہلے کچھ اہم باتیں کرنا
ضروری سمجھتا ہوں۔ میں اتنی بڑی فوج کو اکٹھا کر کے خطاب نہیں کر سکتا۔ آپ سب اپنے
سپاہیوں تک میرا پیغام لفظ بلفظ پہنچا دیں۔ خطیب اور امام نماز کے بعد سب کو میرا
پیغام سنائیں۔ انہیں بتائیں کہ یہ جنگ میری نہیں، ان کی ذاتی نہیں۔ یہ خدا اور رسول
کی جنگ ہے۔ ہم یہاں کفر کے اُس فتنے کو ختم کرنے گئے ہیں جس کے متعلق خدا کا حکم
ہے کہ اُس وقت تک نہ۔ جب تک کفر کا فتنہ ختم نہیں ہو جاتا۔ اگر میں ہندوستان میں
بار بار نہ آتا تو یہ ہندو فتنہ کو فتنے کر کے خانہ کعبہ کی طرف بٹھ رہی ہوتی۔ اُدھر ہندوؤں
اور عیسائیوں کا فتنہ ہے۔ جو ایک طرف توجہ دے سکتے ہیں۔ میں نے ہندوستان کے
بُت خانے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر کے اسے دارالاسلام بنانے کا بیڑہ کر رکھا ہے۔۔۔

مجھے اپنی سلطنت کی توسیع کا کوئی لالچ نہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں نے لاہور کے
بہادر جوں کو کتنی بار شکست دی ہے مگر اس خطے کو اپنی سلطنت میں شامل نہیں کیا۔۔۔
”ساری فوج سے کہہ دو کہ ہم وطن سے دُور صرف خدائے ذوالجلال کے بھر دے

پڑائے ہیں اور خدا صرف اس لیے ہماری مدد کر رہا ہے کہ ہم اُس کا عظیم پیغام اور بیان
ساتھ لاتے ہیں۔ اگر مجھے دولت اور زور و اجرات کا لالچ ہوتا تو میں بار بار یہاں نہ
آتا۔ ایک ہی بار لوٹ مار کر کے غزنی میں تخت پر بیٹھ کر عیش کرتا مگر میں ہر بار یہاں
خود کشتی کرنے آتا ہوں۔ ہر بار توقع ہوتی ہے کہ زندہ واپس نہیں جاسکوں گا لیکن خدا
مجھے ہر بار نئی زندگی عطا کرتا ہے۔ یہ ثبوت ہے کہ خدا مجھ سے ہی اس عظیم مقصد
کی تکمیل کرانا چاہتا ہے جس کے لیے ہم ہندوستان میں آئے ہیں۔ اب مجھے پتہ چلا ہے
کہ تھوج میں مجھے قتل کرنے کے منصوبے بن رہے ہیں۔ میں کمی بھی وقت، کمی بھی جگہ،
اس کمرے میں بیٹھ بیٹھے قتل ہو سکتا ہوں لیکن مجھے اپنے اللہ پر بھروسہ ہے میرے
اندسے آواز آ رہی ہے کہ میں قتل نہیں ہوں گا۔ یہ آواز خدائی ہے۔۔۔

”ساری فوج کو ایک بار پھر بتا دو کہ جہاد مناز سے افضل ہے۔ اسلام کا یہ نظریہ
باد رکھو کہ تم مناز پڑھ رہے ہو اور بتا رہے سامنے سانپ آجائے تو نماز چھوڑ دو اور
سانپ کو مارو۔ میں آپ کو نماز چھوڑنے کا مشورہ نہیں دے رہا۔ میں کہہ رہا ہوں کہ
کوئی مسلمان یہ بھٹکتا ہے کہ وہ صرف مناز سے لہذا کی خوشنودی حاصل کر لے گا تو وہ خوشنودی
میں مبتلا ہے۔ جب تک آپ اس سانپ کو نہیں مار لیں گے جس کا نام ہندو ہے،
آپ خدا کی خوشنودی حاصل نہیں کر سکیں گے۔ میں آپ کو آواز بتا رہا ہوں کہ اس ملک
میں اگر ہندوؤں کو بلا دیتی حاصل رہی تو ہندو مسلمانوں کے لیے زندگی جہنم بنائے رکھیں گے۔
یہ ملک مسلمانوں کی قتل گاہ بننا ہے گا۔۔۔ سپاہیوں کو بتائیں کہ تمہیں اپنے ان ساتھیوں
کے خون کا خراج ادا کرنا ہے جو یہاں شہید ہوئے ہیں اور ان کی لاشیں اپنے وطن واپس
نہیں جاسکیں گی۔۔۔

”میں اپنی فوج کو خبردار کرنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کا یہ خطہ جہاں ہم بیٹھے ہیں بڑا
ہی دُفعرب ہے۔ یہاں کے لوگ بھی حسین اور دُفعرب ہیں۔ میں خود اس علاقے سے
بہت متاثر ہوا ہوں۔ گنگا اور جنانے مل کر اس خطے کو جوں اور دلکشی بخشتی ہے۔ یہ
انسانوں کو سحر کر لیتی ہے۔ تم نے یہاں کی عورتیں دیکھی ہیں۔ میں ان کے حسن میں خطرے
دیکھ رہا ہوں کہ ہمیں ایسا نہ ہو کہ ہمارا کوئی عسکری اس جادو کا شکار ہو جائے۔ اپنے

ادھر عورت کا سحر طاری کرنے والے کو کبھی فتح نصیب نہیں ہوتی۔ ہر فوج کو، خواہ وہ علاء
سے یا سبھی خبردار کر دے کسی نے خدا کے احکام کی خلاف ورزی کی تو میں اسے فوراً خدا
کے پاس پہنچا دوں گا تاکہ وہ دوزخ کی آگ میں پلے۔ میرے پاس ایسے آدمی کے لیے
سزائے موت سے کم کوئی سزا نہیں !

سلطان محمود نے خلیفہ اور اماموں کو نصرت کر دیا اور سالار دل اور دیگر گناہ مندوں
کے سامنے سترائے قنوج تک کا نقشہ پھیل کر بتانے لگا کہ بیشعبدی کا راستہ کون سا ہو گا اُسے
جاسوسوں نے مکمل معلومات دے دی تھیں۔ جاسوسوں کے علاوہ اُس کے اپنے کئی نذر
بھیس بدل کر قنوج تک ہو آئے تھے۔

”راستے میں منہج کا قتلہ آئے گا۔“ سلطان محمود نے کہا۔ یہ راجپوتوں کا شہر ہے اور
یہ راجپوت بہت دلیر ہیں۔ لڑنے میں ہندوستان کی کوئی قوم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہمیں
سب سے پہلے انہیں ختم کرنا ہے۔ اور یہ ہیں اُس وقت پریشان کریں گے جب ہم
قنوج کو محاصرے میں لے لیں گے۔۔۔۔۔ جاسوسوں نے تصدیق کر دی ہے کہ لاہور کا بہادر
بھیم پال ٹنڈا اسی علاقے میں کہیں موجود ہے اور وہ یہاں کے چھوٹے بڑے راجوں کا بہادر
کو میرے خلاف متحد کرنا پھر رہا ہے۔ اُس کے بھائی بھی اُس کے ساتھ ہیں۔ ہمیں پال
کو زندہ پکڑنا ہے۔ کچھ اس قسم کی اطلاع بھی ملی ہے کہ اُس کی فوج بھی اچھڑ رہی ہے میں بوند
اور چوکنار ہننا بڑے گا۔“

سلطان محمود نے ساتویں روز منہج کے قنوج کرنے کا فیصلہ کیا۔ اُس نے گنگ کے
پلے کچھ دستے سترائے رہنے دیے اور جنگ میں نام پیدا کرنے والے دستوں کو اپنے ساتھ
پلنے کے لیے تیار رہنے کا حکم دیا۔

یہ طلوع آفتاب کا وقت تھا۔ سورج ابھرتا آ رہا تھا۔ بہادر راجا پال کا بھائی
پال ایک خیالی جنگل قبیلے کے سردار کے بھیس میں، شیلہ، راوہا اور دمدو گارنوجیوں کے
ساتھ تباہی کے جنگل کے سامنے والے کنارے تک پہنچ چکا تھا۔ وہ دوسری رات یہاں
پہنچے اور رات یہاں ہی گزار دی تھی۔ دسبرجنوری کے دن تھے۔ سردی سخت تھی، اند

ان کی خوش قسمتی تھی کہ وہ رات کو یہاں پہنچے تھے اور دیکھ نہیں سکتے تھے کہ یہ دریا کا ایسا
کنارہ ہے جو ایک جگہ سے آتا اندھ کو آگیا ہے کہ جھیل بنا ہوا ہے اور یہ جھیل گر بھوں کا
مسکن ہے۔ اگر سردی اتنی زیادہ نہ ہوتی تو گر بھ انہیں زندہ نہ رہنے دیتے۔

یہاں ترتیب کبھی سے نہیں دیا ہے جہاں پار کا تھا۔ کچھیں بال اور شیلہ جاگ اٹھے۔

راوہا اور ان کے دوساتھی جو تجربہ کار اور دلیر فوجی تھے، ابھی گہری نیند سوئے ہوئے
تھے۔ کچھیں پال نے شیلہ سے کہا۔ وہ ایک لاکھ دھڑاگے جانے لگا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ دنیا
پر کشتی ران مل جائے ہیں جو اجرت پر دریا پار کر دیتے ہیں۔ وہ چلا تو شیلہ بھی کچھ دُور تک
اُس کے ساتھ چل پڑی۔ یہ ملا تو کچھل چلا تھا۔ بھاریاں بھی تھیں۔ رات کو وہ یہ علاقہ

نہیں دیکھ سکے تھے۔ اب سورج طلوع ہو چکا تھا۔ انہیں سوائے درختوں، جھاڑیوں
اور کہیں کہیں ٹیلوں نیکریوں کے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ دونوں چپ چاپ جا رہے تھے۔
”تم اتنے خاموش کیوں ہو کچھیں؟“ شیلہ نے روک کر پوچھا۔ ایسی خاموشی

خوف کی علامت ہوتی ہے۔“

”خوف نہیں شیلہ!۔۔۔ کچھیں بھی روک گیا اور شیلہ کو سر سے پاؤں تک دیکھ کر بلا۔“

”میں کچھ سوچ رہا ہوں۔۔۔ ہم بہت ہی خوبصورت ہواہمیں احساس نہیں کہ اس جنگل میں
میں کتنی زیادہ خوبصورت لگ رہی ہو میرے اسلحے ایک بار کھینچے کہا تھا کہ انسان
اپنے قتلہ رنگ میں رہنے تو اُس کی صحت اور اُس کے چہرے کی رونق بڑھانے میں
بھی مانہ نہیں پڑتی۔ جی میں آتی ہے ہم اسی پلے اور اسی بھیس میں خون خرابے کے دنیا
سے دھڑکی جھل میں ہیں۔۔۔۔۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ تہارے بال اس قدر روشنی
اور اتنے دلکش ہیں۔ میں متبادری کس کس چیز کی تو لرز کر دوں۔“

شیلہ پر جیسے کچھ اثر نہیں ہوا ہو۔ وہ اُسے چپ چاپ دیکھتی رہی۔ کچھیں پر جیسے
نشاطی ہو گیا ہو۔ وہ شیلہ کی طرف بڑھا اور بازو پھیلا دیے جیسے جن کے اس شاہکار کو
بارنگل میں میسٹ اپنا چاہتا ہو مگر شیلہ نے تھپتھپ گئی۔

”ہوش میں آؤ کچھیں!“ شیلہ نے دھیمی مگر بڑے آواز میں کہا۔ جاگو۔ بارگدہ ادم
کیوں آئے ہیں۔ اپنی سردائی اور جرات پر عورت کے حسن اور جسم کو بھونچو۔ یہ موت سے

کھینٹے آئے ہیں۔

”میں ہوش میں ہوں راجہاری! کہیں نے کہا۔ جانتا ہوں کہ ہم موت سے کھلا آئے ہیں مگر گدستا ہوں کہ تہہ سے جل پڑیں جیسے اس جسم کے ساتھ مسلمان کھینٹیں گے۔“ وہ اچانک بے تاب ہو گیا اور بولا۔ ”تم یہ سب دیکھو۔ میں کیلا مٹھا جاؤں گا۔ حرنی کے سلطان کے سامنے جا کر اسے کوئی دھوکہ دیتے بغیر قتل کر دوں گا۔ تم اور راجہ واپس چل جاؤ۔ میں تمہارے لیے مر جاؤں گا۔۔۔۔۔ لیکن ایک بار شیلا اصراف ایک بار۔۔۔۔۔ ذرا سی دیر کے لیے میرے بازوؤں میں آ جاؤ۔ میں ڈر رہا ہوں۔ اپنی موت سے نہیں، میں اُس وقت سے ڈر رہا ہوں جب وہ مجھے پکڑ کر قتل کر دیں گے اور تبیں اور راجہ کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔“

”بھگن! شیلا نے گرج کر کہا۔ چلے جاؤ۔ یہاں سے چلے جاؤ۔ میں اپنا آپ تمہارے ہی نہیں رہی۔ میں تم سے دور نہیں ہٹ رہی۔ میں ہوش کے لیے تیار ہوں مگر اب نہیں۔ اگر ایک بار میرے تنگے بازو تمہارے عیاں کندھوں سے چھو گئے تو تم بھول جاؤ گے کہ ہم یہاں کیوں آئے تھے میرے چہرے میں غزنی کے سلطان کو دیکھو۔ میری آنکھوں میں اپنی غیرت کو دیکھو۔۔۔۔۔ جاؤ چلے جاؤ۔ کوئی کشتی دیکھو یہیں جہاں جانا ہے۔“

بھگن پال گئے سونے جسم کا جبگو جوان تھا۔ اُس کا سر بابتار تھا کہ لٹو کا دھنی ہے۔ اُس نے شیلا کو نظر بھر کر دیکھا اور یہ کہہ کر چلا گیا۔ ”میں نہیں بالوس نہیں کر دوں گا۔ میں بھلتا تا کہ بالوس نہیں کر دوں گا۔۔۔۔۔ میں کشتی کا بندہ بہت کر کے ابھن آیا۔ اور وہ دور پڑا۔ شیلا اُسے جاتا دیکھتی رہی۔ جھٹل کی جھاریوں نے بھگن کو اُس کی نظر سے اوجھل کر دیا تو بھی وہ اُدھری دیکھتی رہی۔

اپنے قریب شیلا کو کسی کے چلنے کی آواز سنا دی۔ اُس نے اطمینان سے گھوم کر دیکھا۔ اس غیر آج بھگن میں کوئی ہو سکتا تھا۔ غزنی کی فوج وہاں سے میں کچھیں میل دور ستر میں تھی۔ یہاں کوئی اور انسان نہیں ہو سکتا تھا اگر وہ ایک انسان تھا جو آنکھیں پھاڑے ہوئے اُسے دیکھتا آہستہ آہستہ اُس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر سیاہ دالمی تھی۔

اُس کا لباس اس نخل کے لوگوں جیسا تھا۔ وہ سر پہا ہندوستانی تھا۔ اُس کا چہرہ بھرا اور پر زنباب تھا۔ وہ شیلا کے قریب آ کر رکھا۔

”شیلا؟“ اُس آدمی نے پوچھا۔ ”جھٹھ دھوکہ تو نہیں ہو رہا؟ تم منج کے رائے چند کی بہن نہیں ہو۔۔۔۔۔ تم جنگل کی مٹی نہیں ہو۔ میں نہیں کل سے چھپ چھپ کر دیکھتا آ رہا ہوں۔ یہ بھگن ہے نا جو ابھی تمہارے پاس کھڑا تھا؟ ہمارا راجہ فوج کا راجہ رہا؟“ اور تم کون ہو؟“ شیلا نے سرگوشی میں پوچھا۔

اُس آدمی نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا تو داڑھی اُس کے ہاتھ میں آگئی۔ شیلا کے سامنے ایک جوان چہرہ آگیا جو بھگن پال کی طرح خوبصورت تھا اور زنباب سے دھک لہتا تھا۔ عمر بھگن جیسی تھی۔

”ادہ! شیلا نے مسکرا کر کہا۔“ تلوچن پال! تم نہیں جانتے ہو؟۔۔۔۔۔ نہیں نہیں ہونا چاہیے۔“

”مگر تمہیں یہاں نہیں ہونا چاہیے۔ تلوچن پال نے کہا۔ میں چند روز پہلے تمہارے بھائی سے ملے گیا تھا تو تمہارے ساتھ بھی ملاقات ہوئی تھی۔ اس سے پہلے میں نے تمہیں اُس وقت دیکھا تھا جب تم اپنے بھائی کے ساتھ لاہور آئی تھیں۔ اگر میں چند روز پہلے تمہیں منج میں نہ دیکھتا تو میں اس چلنے میں تمہیں نہ پہچان سکتا۔ تمہارے گورے پٹے کندھوں پر کبھرے ہوئے یہ چلیے بھورے بال دیکھ کر اس بیابان میں نہیں کوئی کسی بڑی خوبصورت لڑکی کی جھٹکتی ہوئی نوع سمجھے گا اور کوئی ”بھگن“ کی شہزادی کہے گا۔ میں کل سے چھپ چھپ کر تمہیں دیکھتا آ رہا ہوں۔ تم جانتی ہو میں یہاں کیا کر رہا ہوں۔ میں غزنی کی فوج کی اگلی پیش قدمی دیکھ رہا ہوں۔ ہمارا راجہ بھیم پال یہاں سے تھوڑی سی دُور ہیں۔۔۔۔۔ تمہارے ساتھ راجہاری راوہا ہے۔۔۔۔۔ لیکن یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟ تم لوگ کہیں بھاگے جا رہے ہو؟“

وہ لاہور کے ہمارا راجہ بھیم پال نہ رکھا تھا بھائی تلوچن پال تھا۔ شیلا کی شادی اس کے ساتھ ہو رہی تھی۔ سلطان محمود غزنوی کو صحیح اطلاع ملی تھی کہ بھیم پال مذہبی ہیں کہیں موجود ہے اور اُس کے بھائی بھی اس کے ساتھ ہیں اور وہ یہاں راجوں

بہاراجوں کو سلطان کے خلاف متحد کرنا پھر رہا ہے۔ اس سلسلے میں اُس کا چھوٹا بھائی ترلوچن پال بہو پید میں منج بھی گیا تھا اور تنوج بھی اس سلسلے میں گھومتے پھرتے اُسے شیلہ کا یہ عجیب و غریب قافلہ نظر آیا۔ وہ چُھب کر اُن کا تعاقب کرتا رہا۔ آخر صبح بھین اور شیلہ کو یہاں دیکھا۔ بھین چلا گیا اور شیلہ اکیلی رہ گئی۔

ترلوچن پال سے چھاننے کی ضرورت نہیں تھی کہ یہ قافلہ کہاں جا رہا ہے۔ شیلہ نے اُسے بتایا کہ وہ سلطان محمود کو قتل کرنے جا رہے ہیں۔

”کیا تہہ بھائی رائے چند اپنی بہن اور بیٹی سے لڑنا چاہتا ہے؟“ ترلوچن نے کہا۔ ”راجپوتوں کی عزت کو کیا ہو گیا ہے؟ کیا وہ مسلمانوں سے لڑ گیا ہے؟ ہم اُسے یقین دلا چکے ہیں کہ اگر محمود نے اُسے شکست دے دی تو ہم اس کی شکست کا انتقام لیں گے۔ ہم ابھی اپنی فوج سامنے نہیں لائے۔ ہم نہ سوچا ہے کہ سلطان محمود یہاں لڑو کہ اور طلے فوج کر کے ٹھک جائے اور اس کی فوج کمزور ہو جائے تو ہم اس پر حملہ کر کے اسے ختم کر دیں گے۔ بے شک ہم سلطان کے باجگزار ہیں لیکن ہم موقع کی تلاش میں ہیں۔ اسے قتل کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر اسے قتل کرنا ہی ہے تو بھین پال جلتے۔ اس کے ساتھ دو آدمی ہیں۔ ہم اور راہا یہیں ہے واپس چلو۔“

شیلہ نے اُسے بتایا کہ وہ اپنی مرضی سے آئی ہیں۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ وہ اور راہا کس طرح سلطان محمود اور اس کے سالاروں کو دھوکے دیں گی۔ ترلوچن پال نے اُسے کہا کہ مسلمان اتنی جلدی دھوکے میں نہیں آئیں گے البتہ وہ خود ہی دھوکے میں آکر غریب پنجاہی جاتیں گی اور انہیں رفاقت بنا دیا جائے گا یا سالاروں کی راشتائیں بنی رہیں گی۔ شیلہ نے اُسے راجپوتی عزت یاد دلانی۔ اپنا عزم بتایا مگر ترلوچن پال کی عزت گوارا نہیں کر رہی تھی کہ جس لڑکی کے ساتھ اُس کی شادی ہو رہی ہے وہ اتنے بُرے نظیرے ہیں جتنے۔

”پھر میری جگہ تم جاؤ۔“ شیلہ نے اُسے غصے سے کہا۔ ”تم بُرے دلوں اور چوروں کی طرح جنگلوں میں بھیس بدل کر مارے پھرتے ہو۔ تم غریب کے باجگزار ہو تو یہ

بھی تمہاری بزدلی کا ثبوت ہے۔ تم مسلمانوں سے لڑتے ہو سلطان نے تمہارے پاؤں میں بیڑیاں نہیں ڈال رکھیں۔ اپنی فوج کو یہاں لاؤ اور سلطان کو لٹا کر کہو کہ تم اُسے باج نہیں دو گے۔ یہاں سترہ کے مندر تباہ ہو گئے۔ تم وہاں مسلمانوں کی اذانیں سن رہے ہو مگر تمہاری عزت سو رہی ہے اور تم دوسروں کو بھڑکاتے پھرتے ہو۔ میری عزت مجھے گھر سے نکال لائی ہے۔“

”تم میری ہونے والی بیوی ہو۔“ ترلوچن پال نے غصے سے کہا۔ ”میری منگیتر ہو۔ میں تمہیں آگے نہیں جانے دوں گا۔“

”میں کسی کی ہونے والی بیوی نہیں۔“ شیلہ نے کہا۔ ”میں اُس کی بیوی بنوں گی جو سلطان محمود کو قتل کرے گا، اور وہ بھین پال ہوگا۔ وہ مارا گیا تو محمود میرے ہاتھوں قتل ہوگا۔ راہا کے ہاتھوں قتل ہوگا۔ اس مسلمان کی جان اب میری کھٹی میں ہے۔“ اُس نے مٹھی بند کر کے اور دانت چس کر کہا۔ ”میرے یہ ہاتھ لہندی سے نہیں محمود کے خون سے لال ہوں گے۔ منج کی کوئی راجپوت لڑکی کسی مسلمان کے ہاتھ نہیں آئے گی۔ یہ سارے باب دادا تھے جنہوں نے غریب دالوں سے شکست پر شکست کھائی اور تم خزانہ باج میں لٹا رہے ہو۔ یہ میرے بھائی کا فیصلہ تھا کہ میری شادی تمہارے ساتھ ہوگی۔ میرا فیصلہ اس ترلوچن! مجھے تم جیسے بُروں سے نفرت ہے۔ عورت راجپوت کی جو راج مزدور کی اورہ بھڑک اٹھے تو دریاؤں کو آگ لگا دیتی ہے۔ میرے راستے سے مٹ جاؤ۔ میرا ساتھ بھین سے ہے۔ یہاں نہیں تو آکاش پر بھاری شادی ہوگی اور تم ان جنگلوں میں بھٹکے پھر دو گے۔“

”تم یہ کبھی ہو کہ میں تمہیں اٹھا کر نہیں لے جا سکتا؟“ ترلوچن پال قہر سے اُس کی طرف پلکا۔

شیلہ پیچھے کود دڑی۔ ترلوچن اُس کی طرف دوڑا۔ شیلہ ایک ٹیکری کی اوٹ میں چلی گئی۔ ترلوچن پال اُس طرف گیا تو اُسے شیلہ ایک درخت کے ساتھ کھڑی نظر آئی۔ وہاں درخت زیادہ تھے اور دیا باہر کو آتا ہوا تھا۔ یہ جھیل سی بنی ہوئی تھی۔ ترلوچن پال نے شیلہ کو ایک بار پھر کہا کہ وہ اُس کے پاس آجائے۔ شیلہ نے لٹکا کر کہا۔ ”ہمت ہے تو مجھے کڑو۔ میں تمہارے پاس اس لیے نہیں آؤں گی کہ تم مرد ہو اور میں عورت ہوں۔ سلطان محمود سے

دماغ آگے جاں سے ترلوچن پال بھاگا تھا۔ انہیں دھڑکھڑے دھڑکے کی آواز آئی۔
یہ ترلوچن پال اور اُس کے ساتھیوں کے گھوڑے تھے جنہیں وہ دھڑکھڑے آئے
تھے۔ اگر ترلوچن پال کے محافظ غزنی کے فوجیوں کو نہ دیکھ لیتے تو انہیں بہت برا شکار
مل جاتا۔ ترلوچن پال جاتا تو اس سے معلوم کیا جاسکتا تھا کہ ہمیں پال نذر کہاں ہے۔
پچھن پال کشی کی تلاش میں نکل گیا تھا۔

غزنی کے ان فوجیوں میں ایک نائب سالار تھا اور باقی تین اُس کے دستوں کے
کمانڈر تھے۔ وہ مقررے آئے تھے اور انہوں نے گھوڑوں پر دریا پار کیا تھا جو کچھ بند
بعدیش قدی جوئے والی تھی اس لیے نائب سالار دریا اور اس سے آگے کا جائزہ لے
رہا تھا اور اس علاقے میں مقرر کے دفاع کے لیے دو تین چوکیاں بھی نام کئی تھیں۔ وہ جب
دریا کی بنالی بولی بھیل کے قریب آئے تو انہیں ایک لڑکی بے ہوش پڑی نظر آئی۔ زدار سے
انہیں ایک گرچھ دکھائی دیا جو آدھا پانی میں تھا۔ اُس کے منہ سے لکتا ہوا ایک بلند نظر آ رہا تھا
اور منہ سے لیے لیے ہال بھی لٹک رہے تھے۔ نائب سالار نے ایک اور گرچھ دیکھا جو بے ہوش
رادھا کی طرف آ رہا تھا۔

نائب سالار نے گھمڈے کو اڑھائی۔ اُس کے کمانڈروں نے بھی گھوڑے دوڑائے۔
دونوں گرچھ پانی میں غائب ہو گئے۔ نائب سالار نے کمانڈروں سے کہا کہ یہ کوئی سمیت
خوبصورت جنگی لڑکی معلوم ہوتی ہے۔ اسے اٹھالے چلو۔ رادھا کو ایک گھوڑے پر ڈال لیا گیا۔
وہاں سے بہت کر وہ ادھر کو ہر دیکھنے لگے کہ شاید اس کے ساتھ سے کوئی لوگ نہیں ٹھہرے۔
ہوئے ہوں۔ انہیں دولاٹیں دکھائی دیں۔ دونوں میں ایک ایک تیراڑ تھا۔ انہیں
ایک جگہ پانچ گھوڑے، دو غیر اور دو ہرن کھڑے نظر آئے۔ زمین پر بستر رکھے ہوئے تھے۔
سامان کی تلاش لگئی۔ اس میں سے ہتھیار اور سونے کے بے شمار سکے برآمد ہوئے کچھ
ایسی چیزیں بھی برآمد ہوئیں جو شک پیدا کرتی تھیں۔

نائب سالار پر لڑا تجربہ کار آدمی تھا۔ اُس نے رادھا کو جوابی ایک بے ہوش قیدی اور
سے دیکھا اور کہا کہ یہ لڑکی جنگی نہیں ہو سکتی۔ اُس نے رادھا کو گھوڑے سے اتراد کر منہ

پیلے میں نہیں قتل کروں گی۔ ترلوچن پال وہیں کھڑا سے کہہ رہا تھا مگر کسی کو
وہ اٹنے پاؤں نہیں ہٹنے لگی۔ ترلوچن پال وہیں کھڑا سے کہہ رہا تھا مگر کسی کو
قتل نہیں کر سکو گی۔ میں نہیں بھاگنے نہیں دوں گا۔
وہ اور پیچھے ہٹ گئی۔ ترلوچن پال نے گھبراہٹ ہوئی آوازیں کہا۔ آگے کو بھاگ
آؤ شیل! پیچھے نہ جانا۔

”میں تمہارے اٹھ نہیں آؤں گی۔ شیلانے کہا۔

وہ سمجھ نہ سکی کہ ترلوچن اُسے کتنے بڑے خطرے سے خبردار کر رہا ہے۔ ترلوچن پال
ایک بار پھر چلا گیا مگر بے سود۔ ایک گرچھ جو قریب ہی کہیں چھپا ہوا تھا، شیلانے کے پاس
پہنچے پہنچ چکا تھا۔ ادھر گرچھ آگے بڑھا۔ ادھر سے شیلانے بے خبری میں ایک اہم
پیچھے بنایا تو گرچھ نے اُسے کمرے دانوں کے شکنے میں جکڑ لیا۔ شیلانے کی جھینس اس قدر بلند
اور جوں کی جھینس کہ رادھا جو اُس سے دور سوئی ہوئی تھی جاگ اٹھی۔ اُس نے دیکھا
کہ پچھن پال بھی نہیں، شیلانے بھی نہیں۔ اُس نے دونوں فوجیوں کو دنگایا اور ان کے ساتھ
ادھر کو دوڑی جدھر سے جھینس سنائی دی تھیں۔

ترلوچن پال ایک بھاڑی کے پیچھے ہو گیا۔ پچھن پال کے دونوں فوجی وہاں پہنچے تو
ایک سیٹی سنائی دی جو ترلوچن نے منہ میں انگلی رکھ کر بجائی تھی۔ کہیں سے دھڑکے آئے،
پچھن پال کے دونوں ساتھی ایک ایک تیرے ادھ سے ہونگے۔ یہ ترلوچن پال کے اُن
دو محافظوں کے تیرے جو کہیں چھپے ہوئے تھے۔ رادھانے نہ دیکھا۔ اُسے بان کے کنارے
ایک گرچھ نظر آیا جس کے منہ میں شیلانے چلا رہی تھی اور گرچھ اپنے گز گز لیے جڑے پھال
پھال کر لے کر نکل رہا تھا۔ رادھا کو جکڑ آئے لگا۔ اُس نے دیکھا کہ شیلانے کا صرف ایک بازو
گرچھ کے منہ سے باہر رہ گیا تھا اور اُس کے ریشم جیسے بال بھی نظر آ رہے تھے۔ رادھا کی
آنکھوں کے آگے اندھیرا آگیا اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

ترلوچن پال رادھا کی طرف بڑھا تو اُسے اپنے ایک محافظ کی آواز سنائی۔ رادھا
مسلمان فوجی آ رہے ہیں۔
ترلوچن پال وہاں سے پیچھے ہٹا اور غائب ہو گیا۔ پچھن پال کے چار گھوڑے اور

سامان سے چھٹی سی ایک ڈیر نکالی۔ وہ اٹھ کر تیزی سے ڈیر کھولنے اور دوسری طرف دوڑنے لگی۔ اُسے کڑیا گیا۔ اُس کے ہاتھ سے ڈیر پھین کر نائب سالار نے اُس سے پوچھا۔ ”زہر ہے نا؟“۔ ”نہیں لڑکی! سہلانا تڑپا اور بھگانا بیکار ہے۔ تم ہماری قیدی ہو۔ ہمیں سب کچھ بتانا پڑے گا۔“ نائب سالار کے حکم سے اُسے ایک گھوڑے پر بٹھایا گیا جس کی ناک ایک کمانڈر کے ہاتھ میں تھی۔

پچھن پال یاوس واپس آ رہا تھا۔ اُسے الگ تھک کوئی کشتی نہ ملی۔ وہاں ہی کشتیاں تھیں جو بہت سے سالوں کو پارے جاتی تھیں۔ وہ گھوڑوں اور خچروں کو بھی پارے جاتا تھا تھا۔ ان کے لیے کسی مینس بل رہی تھی۔ وہ پچھن سے ذرا ہٹ کر گزرا تو اُسے شکی بڑا ایک خرچہ نظر آیا جو ایک انسان کی شکل رہا تھا۔ گھرچہ شکار کو کھانے کا یہ طرہ اختیار کرتا ہے کہ پہلے سے نعل کر جان سے مار دیتا ہے پھر اسے شکی بڑا اگل کر اس کے گلے سے مڑنے کا انتظار کرتا ہے جب لاش یا کسی جانور کا ٹرڈر گل کر نرم ہو جاتا ہے تو اُسے نعل لیتا ہے۔ شکار کو نکلنے کے بعد گھرچہ شکی بڑا کر اُسے اگل رہا تھا۔ پچھن پال نے دیکھا کہ لاش کے لیے بے مال تھے اور لباس؟۔۔۔ اُس کا قسم کا بننے لگا۔ وہ یقین نہیں کرنا چاہتا تھا کہ یہ شکار کی لاش ہے۔ اُس نے ٹیکری پر چڑھ کر دیکھا تو اُسے لاش کا چہرہ صاف نظر آنے لگا۔ اسے میں ایک اور گھرچہ دوڑتا آیا اور لاش کو منہ میں لینے لگا۔ لاش کا مالک گھرچہ اُس پر ٹپٹ پڑا۔ پھر ان میں لڑائی شروع ہو گئی۔ آخر ایک نے شکار ایک ٹانگ منہ میں لے لی اور دوسری ٹانگ دوسرے نے منہ میں بھر لی۔ انہوں نے زور لگایا تو لاش بیدار ہو گئی۔ اُس کا چہرہ پچھن پال کی طرف تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اُس میں تو اب اُدھر رکھنے کی بھی بہت نہیں رہی تھی۔ وہ نوکر پچھن نے لاش کی ٹانگوں کو اپنی اپنی طرف کھینچا تو لاش کے دھچھے ہو گئے۔

پچھن پال آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر ٹیکری کی دوسری طرف اُڑا تو اُسے اپنے دو ساتھیوں کی لاشیں نظر آئیں۔ وہ انہیں دیکھ ہی رہا تھا کہ اُسے رادھا کی بیچ مٹا آواز سنائی دی۔ پچھن پال۔ اُس نے اُدھر دیکھا تو اُسے جو کے رہ گیا۔ رادھا غنی کے فوجیوں کے قبضے

میں پائی ٹیکا یا اور منہ پر پانی کے صحنے مارے تو اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ فوراً ہی وہ اٹھ بیٹھی اور یہ دیکھ کر غصہ اُس کے پاس کون کھڑا ہے، اُس نے اٹھ کر چلا تا شروع کر دیا۔

”ٹیکا! پچھن پال!۔۔۔ وہ دوڑ پڑی۔ راجکار! کہاں ہو؟“ نائب سالار نے اُسے کڑیا اور پوچھا کہ وہ کون سے راجکار کو بلارہی ہے۔ رادھا اس قدر حواس باختہ تھی کہ اُس کے منہ سے نکل گیا۔ ”فوج کا راجکار پچھن پال! تم نے اُسے دیکھا ہے؟“۔ ”وہ چونک پڑی اور اُس نے لب و لہجہ بدل کر اداکاری شروع کر دی۔“ میں فوج کے قریب کے ایک جگہ کے قبیلے کی لڑکی ہوں۔ ہم غنی کے سلطان کے پاس سامان ہونے کے لیے جا رہے ہیں۔“

”قبیلے کا نام کیا ہے؟“ نائب سالار نے پوچھا۔ اور وہ جنگل فوج سے کتنی دُور ہے؟“

”لڑکی گھبرائی۔ اُسے کسی نے یہ نہیں بتایا تھا کہ ہر قبیلے کا نام بھی ہوتا ہے۔ اُس نے جنگل کے سسلی بتایا تو نائب سالار نے کہا۔“ دیکھو لڑکی! میں غنی کا رہنے والا ہوں اور تمہاری زبان بول رہا ہوں۔ اس سے کچھ لو کہ میں تبدلے علاقے سے واقف ہوں۔ میں فوج کے ارد گرد کا علاقہ دیکھ آیا ہوں۔ وہاں کوئی ایسا جنگل نہیں ہے جس میں اتنا خوبصور قبیلہ رہتا ہو جتنی خوبصورت تم ہو۔“

”لڑکی کا راجپوتی خون جوش میں آ گیا۔ اُس نے نائب سالار اور کمانڈروں کو لٹکانا شروع کر دیا۔“ خبر دار میرے قریب نہ آنا۔ میں زندہ تمہارے ہاتھ نہیں آؤں گی۔“ نائب سالار نے اُسے بازو سے پکڑ کر کہا۔ تم خوش قسمت ہو کہ میرے ہاتھ آئی ہو۔

تم اتنی زیادہ خوبصورت ہو اور تم نے لباس ایسا عریاں پہن رکھا ہے کہ اس جنگل میں جس کسی کے ہاتھ آجاء وہ تمہیں اپنی بیٹی اور بہن نہیں کہے گا۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میری بہن میں خود نہیں آئے گا، اور اگر تم مجھے جھانسنے دیتی رہو گی تو میں ان تینوں کے حوالے کر کے خود چلا جاؤں گا۔ انہیں اچھی طرح دیکھ لو۔ اگر اپنے آپ کو بچانا چاہتی ہو تو بتا دو کہ تم لوگ کون ہو اور راجکار پچھن پال کہاں ہے اور یہاں کیوں آیا ہے۔“ رادھا اپنے تانے کے سامان کی طرف دوڑی۔ سب اُسے دیکھتے رہے۔ اُس نے

میں تھی۔ کھین نے بھاگ اٹھنے کے لیے بوہرا بھر دیکھا تو اسے نائب سالار کی آواز سنائی دی۔
”گھوڑے سے تیر نہیں بھاگ سکو گے لڑکے! اور ہر آد۔ زندہ رہو گے۔“

اُسے ایک گھوڑے پر بٹھا کر نائب سالار نے کمانداروں سے کہا کہ واپس چلو۔ وہ
کھین پال کو اپنے ساتھ لے کر سب سے پیچھے رہا۔ اُس نے کہا۔ ”اُس لڑکی نے سب کچھ
بتا دیا ہے اُس لیے ہم اسے پوری عزت کے ساتھ ستر لے جا رہے ہیں۔ تم اس کے ساتھ
رہنا اور دیکھنا کہ کئی مرد اس کے جسم کو ہاتھ نہیں لگائے گا لیکن اس کی عزت ہمارے ہاتھ
میں ہے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم کتنا کچھ بچ لو گے۔ اگر تم نے صحت بولا تو تم شاید تصور
میں نہیں لاسکو گے کہ اس کے ساتھ کیا سلوک ہو گا۔ دیکھو لڑکی کتنی خوبصورت ہے۔ اگر میں
نہ ہوتا تو یہ تین فوجی اس لڑکی کو اس طرح عزت سے ستر لے لے
جاتے۔ پورا جکار! مجھے بتاؤ کہ قلعہ کا مالدار اس عجیب سے جیلے میں کیا کیوں آیا
ہے؟“

”اگر آپ ہم دونوں کو چھوڑیں تو میں آپ کو اتنا سدا دے دوں گا جتنا آپ کہیں گے۔“
کھین پال نے کہا۔ ”آپ چاروں میرے ساتھ قلعہ چلیں میں آپ کے گھوڑے
سونے سے لادوں گا۔“

”اگر میں انعام کا خیال ہوتا تو یہ اتنی حسین لڑکی بہت بڑا انعام ہے جو ہم نے لے لیا ہے۔“
نائب سالار نے کہا۔ ”اور شمارے سامان سے سونے کے بے شمار سکے بھی ملے ہیں
جو ہم چاروں آپس میں بانٹ سکتے ہیں۔ تم مجھے قلعہ لے جانا چاہتے ہو تم وہاں سے آ رہے
ہیں۔ وہاں سے تم خود اپنے گھوڑے سونے سے لادیں گے۔ میں تو تمہیں انعام دیدی
چاہتا ہوں۔ سچ بولو اور انعام میں اپنی جان اور یہ لڑکی لے جاؤ۔“

وہ چلتے گئے اور انہوں نے گھوڑوں پر دریا پار کیا۔ وہ جھونپڑی سے گزرے۔
ویرانوں میں سے گزرے۔ سورج غروب ہو گیا تو تاریکی میں چلتے رہے۔ راستے میں فدا نام
کے لیے رُکے کسی نے بھی رادھا کے ساتھ بات نہ کی۔ رات خاصی گزر چکی تھی جب یہ
نافذ ستر کے قریب پہنچ گیا۔

کھین پال کے ساتھ تمام راہ نائب سالار نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ اُس نے کھین
سے ایک ہی بار کہا تھا کہ وہ سچ بتا دے کہ یہاں کیوں آیا ہے کھین پال نے انعام پیش
کرنے کے سوا کوئی جواب نہیں دیا تھا لیکن جب یہ نواز ستر میں داخل ہونے لگا تو
کھین پال نے لپک کر نائب سالار کے بازو پر ہاتھ رکھ دیا۔

”میں سچ بولوں گا۔“ اُس نے کہا۔ ”میں سُن لیں۔ میں آپ کے سلطان کو قتل
کرنے آیا تھا۔“ اور اُس نے اپنا تمام تر منصوبہ بتا دیا، مگر یہ نہ تاس کا کیشلا گرجہ کے پیٹ
میں کیسے پہنچی اور اس کے دس ایتھوں کو تیروں کے کس نے ہلاک کیا ہے۔ اُس نے کہا۔
”میں نے آپ کی سزا سے فخر اتراف نہیں کیا۔ میں آپ چاروں کے اخلاق سے متاثر ہو
کر مجبور ہو گیا ہوں کہ آپ کے سامنے سچ بولوں۔ آپ نے میرا اتنا بڑا انعام ٹھکرا دیا۔ ہم نے سارا
دن اجڑا دیا میں سخر کیا ہے۔ رات کے اندھیرے میں بھی سخر کیا ہے۔ مجھے یہ خطرہ برطان
کتابدار کو آپ اس لڑکی کو ذرا کریں گے اگر آپ کو جیسے احساس ہی نہیں تھا کہ آپ کے
قبضے میں اتنی حسین لڑکی ہے جو غزنی نے بھی پیدا نہ کی ہوگی۔ آپ نے تمام راستے ہمارے
ساتھ کوئی بات نہیں کی۔ میں بھگیا ہوں کہ آپ کو فتح کا راز کیا ہے۔ اب مجھے سچ بولنے
کا انعام دیں۔۔۔۔۔ انعام صرف آٹھ سو کبھے بے شک جلاد کے حوالے کر دیں لیکن اس
لڑکی کو اس کے ماں باپ کو واپس کر دیں۔ اس کی دلیری اور جرات دیکھیں۔ اگر آپ واقعی
جنگجو ہیں تو ایک جگہ باپ کی غیرت مندی میٹی کو اس کی دلیری کا خراج دیں۔ یہ کنواری لڑکی ہے۔
”اس کا ہیصلہ سلطان محمود کریں گے۔“ نائب سالار نے کہا۔ ”میں تمہیں بغین دلاں
ہوں کہ یہ لڑکی کنواری ہے گی اور مجھے اُمید ہے کہ تمہیں جلاد کے حوالے نہیں کیا جائے گا۔“

”تمہ نے کوئی جرم نہیں کیا۔ ہم تمہیں جلاد کے حوالے نہیں کریں گے۔“ سلطان محمود نے
کھین پال کی زبانی وہی کہاں جو اُس نے نائب سالار کو سنائی تھی، سن کر اُسے کھانا۔ ہم تم
جیسے میٹوں اور اس لڑکی جیسی بیٹیوں کی دل سے ہر قدر کرتے ہیں۔ سزائے موت تو بہت
بڑی بات ہے۔ ہم تمہیں طرہ بھی نہیں دینگے کہ تم اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکو۔ ہم غیرت مند

بھی ساتھ گیا۔ بڑی لمبی مسافت کے بعد وہ راہدا کوئٹج کے قلعے سے کچھ دور اور محسن پال کو قلعہ ج کے قریب چھوڑ کر واپس آگئے۔

محسن پال ایلیوسی اور شکست خوردگی کے عالم میں اپنے باپ بہادر راجا پال کے سامنے جا کھڑا ہوا اور اُسے بتایا کہ اُس پر کیا گزری ہے۔

”میں آپ کو صاف بتا دیتا ہوں کہ غزنی کے سلطان سے آپ شکست کھائیں گے۔“
— محسن پال نے اپنے باپ سے کہا۔ ”آپ اسے شکست نہیں دے سکتے۔“
”پتا بہاراج! میں نے غزنی کے اس سلطان کی آنکھوں میں جادو کا اثر دیکھا ہے اس کی فوج کے حاکم کسی اور ہی مٹی کے بنے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اُن کی فتح کلاز کچھ اور ہے۔ کون راہدا جیسی لوجوان اور خوبصورت لڑکی کو اور اپنے دشمن کے بیٹے کو اس طرح راکڑتا ہے؟“

محسن پال نے اپنے باپ کو سدا و آقا سنایا۔ محسن پال نے لکھا ہے کہ قلعہ ج کے بہادر راجا پال پر ایسا تاثر طاری ہو گیا کہ اس نے خفیہ طور پر اپنا تمام خزانہ قلعہ ج سے دُور پہاڑی علاقے میں منتقل کرنے کا حکم دے دیا۔ اُن کی رات خزانہ ایسے طریقے سے قلعے سے نکلنے لگا کہ کسی کو ذرا سا بھی شک نہیں ہوتا تھا۔

راہدا جب اپنے باپ رائے چندا کو بتاتی تھی کہ اُسے اور محسن پال کو سلطان نے کس طرح راکڑا ہے تو اُسے یقین نہ آیا یا اُس نے کہا کہ راجپوت اپنی بے عزتی کا انتقام لیں گے۔

سلطان محمود غزنوی نے کچھ دتے سمجھائے دیئے اور باقی فوج کو کوئٹج کا حکم دے دیا۔ اُس نے سمجھ کر قریب سے دیائے جنا پار کیا اور دریا کے ساتھ ساتھ کوچ کرنا شروع کر لیا جہاں راجپوت زندگی اور موت کا آخری سحر کر لڑنے کے لیے تیار تھے۔ سلطان کو جاسوسوں نے بتایا تھا کہ غزنی کی فوج کا صحیح مقابلہ شیخ میں ہو گا۔ وہاں غزنویں ہورہے تھے بھی لڑنے اور مرنے کے لیے تیار تھے۔

دشمن کی عزت کیا کرتے ہیں۔ مجھے قتل کرنے کی تیس ہزار کوشش کرنی چاہیے تھی۔ کاسیالی اور ناکانی شہزادے کرشن واسدیل اور ہر ہر بہادلو کے اختیار میں نہیں، ہمارے قتل کے اختیار میں ہے۔ یہ ہے خدا کا وہ پیغام جس میں ہندوستان میں لایا ہوں؟

محمود غزنوی نے اپنے ترجمان سے کہا۔ ”اس شہزادے سے کہو کہ لڑکے کے باپ سے کہیے کہ میں نے شیخ کے راجپوتوں کی غیرت اور عزت کی بہت باتیں سنی ہیں لیکن غیرت والوں کی بیٹیاں لڑن لگی ہو کر اپنے دشمن کے لیے حسین دھوکہ بن کے اُس کے پاس نہیں جلا کر تیں۔۔۔۔ اور اس شہزادے سے کہو کہ اپنے باپ سے کہہ دے کہ ہم آہستہ میں اور وہ بھی قتل کرنے کے لیے سامنے آئے۔۔۔۔ اور اس شہزادے سے کہو کہ ہم اسے پرغان کے طور پر رکھ سکتے تھے مگر ہم اوجھ نہیں۔ ہم اپنی شریف میدان جنگ میں منوایا کرتے ہیں؟“

ترجمان نے محسن پال کو بتایا کہ سلطان کیا کہہ رہے ہیں۔

”اور ہم اس شہزادے سے کوئی فوجی راز بھی نہیں لیں گے۔“ سلطان محمود نے کہا۔
”اے کہو کہ ہم قلعہ ج کے اندر باہر سے واقف ہیں۔ ہماری آنکھیں قلعہ ج کے قلعے کے اندر ہیں۔“
محسن پال سلطان محمود کے چہرے پر نظریں گاڑھے ہوئے تھا۔ وہ حیرت کے عالم میں تھا۔ راہدا بھی حیران تھی کہ سلطان محمود اُن کی قسمت کا کیا فیصلہ کر رہا ہے۔

”تم دونوں اپنے اپنے باپ سے کہنا کہ اُسے بغیر قلعے ہمارے حوالے کر دیں۔“ سلطان محمود نے کہا اور ترجمان نے اس کا ہندوستانی زبان میں ترجمہ کیا۔ ”اگر ہم نے قلعے کو کیلے تو تم دونوں کے باپوں کا انجام بہت بُرا ہو گا۔“

سلطان محمود غزنوی نے حکم دیا۔ ”ان دونوں کو ان کے شہروں کے قریب چھوڑ

اؤ۔ انہیں عزت سے بے جاؤ۔ ان کے گھوڑے اور ان کے بھیر انہیں بے دوز

محسن پال اور راہدا کچھ دیر محمود غزنوی کے چہرے پر ٹپکنی باز دیکھتے رہے۔

انہیں جب وہاں سے چلنے کو کہا گیا تو محسن پال نے سلطان کے پاس جا کر اُس کا ہاتھ پکڑا اور چوم لیا۔ راہدا سلطان کو حیرت سے دیکھتی رہی۔

دونوں کو قلعہ ج کے دس بارہ سپاہیوں کے ساتھ رخصت کر دیا گیا۔ ان کا ایک کمانڈر

خدا جوں میں اتر گیا

کے گرد و زان میں جنگل تھا جو کہیں کہیں بہت گھٹا ہو جاتا تھا۔ کہیں کہیں پہاڑیاں اور چٹانیں بھی تھیں۔ قنوج دریا نے گنگا کے کنارے پر واقع تھا۔ قلعہ اس طرح تعمیر کیا گیا تھا کہ اس کی ایک طرف دریا تھا جس کا پانی (سمندروں کے الفاظ میں) قلعے کی ایک دیوار کو دھوتا رہتا تھا۔ یہ اپنے زمانے کا مشہور قلعہ تھا۔ مضبوط بھی تھا اور دُور دُور تک احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔

۱۰۱۸ء میں سلطان محمود غزنوی قنوج سے کوچ کر کے پنج کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا۔ قنوج وہاں سے ایک سو پچیس میل دُور تھا۔ قنوج سے چار پانچ میل دُور جنگل میں جہاں آبادی کا دُور دُور تک نام و نشان نہ تھا، وہ آدمی گھڑیوں کے لباس میں ایک جٹان پر بیٹھ جوتے تھے۔ سورج غروب ہونے کو تھا۔ ایک نے دوسرے سے کہا کہ رات بیس لُڈا ریتے ہیں۔

”آج قیسر ملتا ہے ہم قنوج کے قریب سے ہو آئے ہیں۔“ ایک نے کہا۔
”ہمیں قنوج کی یا کسی اور ہندو بہاؤ کے قنوج نظر نہیں آئی۔ کیا قنوج کی قنوج اُس وقت باہر آئے گی جب ہماری قنوج قریب آجائے گی؟“

”ہمیں اپنی قنوج کے آنے تک اسی علاقے میں رہنا ہے۔ طلال بھائی!“
دوسرے نے کہا۔ ”یہاں اُس وقت دالیں جائیں گے جب ہمیں قنوج کی قنوج نظر آجائے گی۔ سلطان کو بتایا گیا ہے کہ وہ جب پنج کا میسرہ کرے گا تو قنوج کی قنوج عقب سے حملہ کرے گی۔ سلطان کو یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ہماری قنوج کا مقابلہ قنوج اور قنوج کے

درمیان ہو گا۔ ہمیں معلوم کرنا ہے کہ قنوج کی وہ قنوج کہاں ہے جسے ہماری قنوج پر عقب سے حملہ کرنا ہے۔۔۔ معلوم ہوتا ہے تم تنگ آگئے ہو۔“

”نہیں صاحب!“ طلال نے کہا۔ ”میں اتنی جلدی تنگ آنے والا نہیں۔ میرا خیال ہے ہمارا قنوج باہر آ کر لڑنے کی جرأت نہیں کرے گا۔“

”ہمیں قنوج معلوم کرنا ہے کہ وہ ایسی جرأت کرے گا یا نہیں۔“ صاحب نے کہا۔
”ہم دونوں غزنی کی قنوج کی دعا نکھیں ہیں۔ ہمیں سلطان محمود کو بتانا ہے کہ جنگل صاف ہے یا یہاں کوئی خطرہ ہے۔“

”آؤ پھر ہمیں سوچ جائیں۔“ طلال نے کہا۔ ”سروی تو بہت سست ہے لیکن رات گزر جائے گی۔“

طلال ابراہیم اور صاحب بروہہ ہندوستانی مسلمان تھے۔ صاحب بروہہ اُن غزنیوں کی نسل سے تھا جو محمد بن قاسم کے ساتھ ہندوستان میں آئے اور وہیں آباد ہو گئے تھے اور طلال ابراہیم کے آباؤ اجداد کا مذہب کچھ اور تھا۔ وہ محمد بن قاسم کے دُور حکومت میں مسلمان ہوئے تھے۔ اب ہندوستان میں محمود غزنوی کی جنگی بہات اور

بُت شکنی کا سلسلہ شروع ہوا تو غزنی کی قنوج کو ٹیپو جس کے لئے ہندوستان کے سلطان باشندوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہ عام شہم کی فوجی بھرتی نہیں تھی کہ ہر اُس جوان کو بھرتی کر لیا جاتا جو تنگ نئی اور گھوڑ سوار کی سوجھ بوجھ رکھتا تھا۔ جاسوسی کے لیے ایسے افراد کی ضرورت تھی جو دھائی سے غریب معمولی طور پر ترزا اور دھین تھے اور جو

ادا کار کی کی دہات رکھتے تھے اور جو کئی کئی روز تک ہر قسم کے موسمی حالات میں جنگوں، پہاڑوں، صحراؤں اور میدانوں میں تندرست رہنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ سب سے بڑی خوبی یہ دیکھی جاتی تھی کہ ان کا کوئی رنجتہ ہو اور لڑکھو کتا ہی دیکھ کر کچل نہ ہو اسے قبول نہ کریں۔ ان میں ہندوؤں کی پھرتی، گھوڑے کی طاقت، عقاب کی نظر اور چیتے کی چھٹ کا ہونا بھی لازمی تھا۔ بنیادی ضرورت ایمان کی تھی۔

ہندوستان کے مسلمانوں میں جذبہ موجود تھا۔ ہندوستان بے شمار راجوں، بادشاہوں میں بٹا ہوا تھا۔ وہ سب ہندو تھے، اندہ مسلمانوں پر بھروسہ نہیں کرتے تھے۔

کچھ اکٹا یا سانگ رہا تھا۔ عربی نسل کا صانع بروک پہلے روز کی طرح توڑنا نہ تھا۔ وہ اپنے فرض سے کوتاہی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ نو سہر کا ہیڈ تھا اور اس علاقے میں سردی خاصی زیادہ ہوگئی تھی۔ وہ چٹان پر ایسی جگہ بیٹھ گئے جہاں سرد ہواؤں سے بچنے کے لیے ادھڑ موجود تھی۔

رات کا پہلا پہر گزرتا تھا جب صانع بروک کی آنکھ کھل گئی۔ وہ کچھ آوازوں سے جاگ اٹھا تھا۔ وہ جس چٹان پر سوئے ہوئے تھے اس کے نیچے اُن کے قریب ہی سے کچھ لوگ گزرتے تھے۔ گھونڈوں کے پاؤں بھی سنا دے رہے تھے۔ صانع کو روشنی بھی نظر آئی۔ وہ کروٹ بدل کر پیٹ کے بن ہو گیا اور چند گز آہستہ آہستہ رنگ کر آگے ہو گیا جہاں سے اُسے اپنے نیچے ایک عجیب تافہ گزرتا دکھائی دیا۔ سب سے آگے دو آدمی مشعلیں اٹھاتے چلے جا رہے تھے۔ اُن کے درمیان ایک تو سزا آدمی تھا۔ اُس کے لباس سے پتہ چلتا تھا کہ پندت ہے۔ اس کے پیچھے پنج خمریں جاری تھیں جو ایک دوسری کے پیچھے بندھی ہوئی تھیں۔ اگلی خمر کی لٹا پندت کے اٹھ بیٹھ تھی۔ سب سے آخری خمر کے ساتھ ایک لمبی رسی بندھی ہوئی تھی خمروں کے پیچھے سات آٹھ آدمی تھے۔ ہر ایک نے یہ رسی پکڑ رکھی تھی اور ایک ہاتھ اپنے سے اگلے آدمی کے کندھے پر رکھا ہوا تھا۔ عجوبہ یہ تھا کہ پندت کے سوا ہر آدمی کی آنکھوں پر سیاہ پٹی بندھی ہوئی تھی اور وہ اندھوں کی طرح آہستہ آہستہ چلے جا رہے تھے سب مخلوق والے آدمیوں کی بھی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔

پندت تھوڑے تھوڑے وقفے سے کہتا جا رہا تھا۔ ”چلے چلو میں دیکھ رہا ہوں۔ راستہ صاف ہے۔“ عجیب و غریب تافہ آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔ خمریں پر کڑی کے دھک لے رہے ہوئے تھے۔ صانع بروک رنگ کر اپنے ساتھی بلال ابراہیم تک آیا۔ اسے دیکھا اور اُس کے کان میں سرگوشی کی کرینگ کر اُس کے ساتھ آئے۔ اب دلوں نے اندھوں کا یہ تافہ دیکھا۔ انہیں کچھ پتے نہ پڑا کہ یہ کیا ہے۔

چالیس پچاس گز آگے جا کر تافہ روک گیا۔ دلوں ایک اور چٹان دیوار کی طرح سیدھی کھڑی تھی۔ بلال اور صانع چٹان کے اوپر اوپر بے پاؤں چلتے دلوں تک چلے

جب سے سلطان محمود غزنوی کے حملے شروع ہوئے تھے، ہندوؤں نے ہر مسلمان کو غزنی کا جاسوس کھنڈا شروع کر دیا تھا۔ اس کے باوجود یہاں کے مسلمان غزنی کی فوج کی مدد اور اہمائی کرتے تھے اور کئی ایک باقاعدہ مشرف (انٹیلی جنس ایجنٹ) بن گئے تھے مگر ان میں کوئی ایسا بھی نہیں آتا تھا جو اپنے نفس کے دھوکے میں ہندوستان کے کچھائے ہوئے دلکش جال میں آجاتا تھا۔

طلال ابراہیم اور صانع بروک سلطان محمود کی انٹیلی جنس کے شرف سے تھے سلطان محمود کو سترائیں بتایا گیا تھا کہ اُس نے جس آسانی سے مستحق فوج کر لیا ہے، اسی آسانی سے قنوج کا قلعہ سر نہیں کر سکے گا اور جب دیکھا جائے گا کہ کدھر سے پرواغ منیج نام کے قلعے کا محاصرہ کرنے کا قنوج کی فوج اُس پر محنت سے حملہ کرے گی اور اُسے دروازے کھٹکا اور جنگ کے درمیان علاقے میں لڑنا پڑے گا جس میں اُس کی شکست کا امکان زیادہ ہے۔ ایک خطرہ یہ بھی تھا کہ لاہور کا بہادر جی بھی یہاں بڈرا اس علاقے کے سر رہتے رہتے اور ہمارے جیسے سلطان محمود کے خلاف اتحاد پر تامل کر رہا تھا۔ خطرہ یہ تھا کہ وہ اپنی فوج بھی لے آیا ہوگا۔

سلطان محمود کی فوج مسلسل لڑا کر تھک چکی تھی۔ فوج کی نفی زخمی اور شہید بھی ہوئی تھی اور یہ فوج اپنے مستحق غزنی سے تین ماہ کی مسافت جتنی دُور تھی۔ وہ بہت جلد خطرے میں آگیا تھا۔ جاسوسوں کی رپورٹوں کے مطابق اسے دیلے گنگا اور جانا کے درمیان ہندوؤں کی کثیر تعداد اور تازہ دم فوج کے خلاف لڑنا تھا۔ اُس نے مستحق اسے کوئی کیا تو بلال ابراہیم اور صانع بروک کو چند روز پہلے قنوج کے گرد و لواح میں بھیج دیا گیا تھا کہ وہ ہندوؤں کی فوجوں اور خصوصاً قنوج کی فوج کی نقل و حرکت دیکھ کر فوراً اطلاع دیں۔

دونوں کو اس علاقے میں غریب اور خانہ بدوش گڈریوں کے بھیس میں گھومتے پھرتے تین دن ہو گئے تھے۔ انہوں نے بلند درختوں اور پہاڑیوں پر بھی چڑھ کر دیکھا تھا۔ انہیں کسی فوج کا نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ گنگا کے بھی دیکھا تھا۔ انہیں فوج کی کوئی کشتی نظر نہیں آئی تھی۔ ان دلوں میں بلال ابراہیم

گئے جہاں مافذ رکھا تھا۔ دونوں دہان چٹان پر ایک دھڑکتی ادھ میں بیٹ گئے۔ مافذ اس چٹان اور ساتھ مال فودی چٹان کے درمیان رکا ہوا تھا۔ مشعلوں کے شعلے بہت بڑے تھے۔ طلال اور صالح کو دہان دوسری چٹان میں ایک خلا نظر آیا جو نیچے سے اوپر تک چلا گیا تھا۔ خلا یا شگاف اتنا فراخ تھا کہ ایک بچہ اس میں سے کسانے سے گزند سکتی تھی۔

پنڈت نے ایک مشعل بردار کے ہاتھ سے مشعل لے لی اور بولا: سب ہمیں کھڑے رہو۔ میں واپس آکر تمہیں آگے لے جاؤں گا۔ پنڈت شگاف میں چلا گیا اور بائیں کو چٹان کی ادھ میں ہو گیا۔ کچھ دیر بعد نظر آیا۔ مشعل کی روشنی میں اس شگاف میں سے پیچھے چٹان کی دیوار نظر آئی۔ پنڈت دہان کہیں غائب ہو گیا۔ مشعل کی روشنی بھی کہیں گم ہو گئی۔ پھر دوسرے سے وقت بعد اس کی مشعل پھر نظر آئی۔ وہ شگاف سے باہر آ گیا۔

”کوئی آدمی اپنی آنکھوں کی ٹی میں سے دیکھنے کی کوشش نہ کرے۔“ پنڈت نے کہا۔ کسی نے ٹی ہٹانے کی کوشش کی تو اس کی سزا موت ہو گی۔“ ان آدمیوں کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی رہیں۔ پنڈت ان کے ہاتھ پیر پکڑ کر ان سے پھروں سے کبھی اتروانے لگا۔

ایک مشعل اس نے اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ دوسرے مشعل برداروں کو اس نے اپنی ضرورت کے مطابق کھڑا کر دیا تھا۔ یہ اندھے کس اٹھا کر چلتے تھے۔ بعض گرج بھی پڑتے تھے اور غائب ہوتے جا رہے تھے۔ کرتے کرتے پھروں سے کبھی اتر کر چٹان کے اندر چلے گئے۔ پھر باہر کھڑی رہیں اور تمام آدمی اندر چلے گئے۔ ہمیں کوئی شک نہیں تھا کہ یہ مال و دولت تھا جو یہاں چھپا جا رہا تھا، مگر ان آدمیوں کی آنکھوں پر پٹیاں کیوں بندھی ہوئی تھیں؟

”یہ آدمی ڈاکوؤں کا سردار ہے۔“ طلال ابراہیم نے کہا۔ ”اور یہ باقی آدمی بیکار ہیں پکڑے ہوئے ہیں۔“

”شاید اس کا کردہ مزید نوٹ مار کے لیے چلا گیا ہو گا۔“

”صالح! طلال نے کہا۔ مگر یہ لوگ یہاں پہرہ بٹھائیں تو اس مال سے ہم کچھ حصہ جو ہم اٹھا سکتے ہیں، انکار لے جاسکتے ہیں۔ کیا ارادہ ہے؟“ مسوئوں میں آد طلال ابراہیم نے کہا۔ ”ان خزانوں سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں۔ ہمیں وہ خزانہ ادا کرنا ہے جس کے لیے ہمیں یہاں بھیجا گیا ہے۔“ ”میں خزانہ کو نہیں بھول رہا۔“ طلال نے کہا۔ ”رات تو ہمیں ہمیں گزرتی ہے۔ ہم کوئی کام نہیں کر رہے جو کام ہو گا صبح ہو گا۔ رات کو یہ کام کرتے ہیں کہ یہ لوگ اگر چلے جائیں تو ہم غار کے اندر چلے جائیں گے۔ اندر کوئی نہیں ہو گا۔ کوئی ہتھیار تو وہ بھی کس اندر لے جانے کے لیے باہر آتا۔“

”ہم اندر نہیں جائیں گے۔“ صالح نے کہا۔ ”تو نے ہوئے خزانوں کو دل سے اتار دیا۔ خزانے اور عورت کی کشش نے بادشاہوں کے تختے اٹائے ہیں۔ دل سے طبع نکال دے۔“

”تم پتھر ہو۔“ طلال نے جھنجھلا کر کہا۔ ”تم پاگل ہو۔“

صالح بردک کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ شعلیں باہر آگئیں اور اس کے ساتھ ہی وہ آدمی جو پنڈت لگا تھا اور باقی سب آدمی اس کے پیچھے پیچھے باہر آگئے۔ پنڈت ان کے ہاتھ پیر پکڑ کر پھروں تک لایا۔ اس نے انہیں پھروں پر سوار کر دیا۔ پھر مسوئوں میں حصے اور آدمی زیادہ۔ ایک ایک پھر پنڈت نے وہ دو آدمی سوار کر دیئے اور ان کے لگا ایک دوسری پھر کے پیچھے ہاتھ کر خود اگلی پھر کی ٹھاک پکڑ لی اور پھیل چل پڑا۔

وہ جب مدد نکل گئے تو طلال نے ایک بار پھر صلح سے کہا کہ جلد دیکھتے ہیں یکساں ہے۔ ہر صلح نے اسے سختی سے منع کر دیا اور اسے یہ بھی کہنا پڑا کہ طلال نے اگر یہ ضد جاری رکھی تو صالح اسے قتل کر دے گا۔ طلال ابراہیم ہنس پڑا اور دونوں پھر سو گئے۔ رات تھوڑی رہ گئی تھی۔

ابھی صبح دھندلی تھی جب یہ پنڈت بہاراج منوج راجیا پال کی خواب گاہ کے دروازے پر کھڑا ہوا۔ یہ بہاراج کے جاگنے کا وقت نہیں تھا مگر خواب گاہ کی خلوص

جو باہر کھڑی تھی، پنڈت کو دیکھتے ہی اندر چلی گئی اور باہر اگر پنڈت سے کہا کہ اندر چلا جائے۔ وہ دروازے میں داخل ہوا تو شکستہ رانی اندر سے نکل کر شکستہ سال سے کم عمر کی چھوٹی رانی تھی۔ بڑی رانی بخشش کی عمر چالیس سال سے خاصی اور پرہیزگاری تھی۔ شکستہ بہت خوبصورت اور بڑے ہی دلکش جسم کی عورت تھی۔ وہ خواب گاہ سے نکل کر توڑیوں چل رہی تھی جیسے خواب میں چل رہی ہو۔ آنکھیں نیم دائیں اور قدم بے خیال میں اٹھ رہے تھے۔ اس کے جسم سے جہاں مدھوش کر دینے والے

ھلکے خوشبو آ رہی تھی وہاں شراب کی بو بھی تھی۔
 ہمارا راجا پال نے پنڈت سے کہا کہ دروازہ بند کر کے اُس کے قریب بیٹھ جائے۔
 رات خزانے کی اسخری کھپیپ دہاں پہنچا دی گئی ہے۔ پنڈت نے کہا۔
 ”کیا ان تمام آدمیوں کو قید میں ڈال دیا گیا ہے جنہوں نے کس غاریں رکھے تھے؟“ ہمارا راجا توج نے پوچھا۔

”انہیں قید میں ڈالنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کی آنکھوں پر سیاہ پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔“ پنڈت نے کہا۔ ”پھر بھی آپ کے حکم کی تعمیل کی گئی ہے۔ ان سب کو قید میں ڈال دیا گیا ہے اور میں نے قید خانے والوں سے کہہ دیا ہے کہ ان سب کو نہایت اچھی خوراک دی جائے اور انہیں ہر طرح سے آرام اور عزت سے رکھا جائے۔“

”پنڈت جی ہمارا راجا! ہمارا راجا پال نے کہا۔ اب صرف آپ ہیں جو خزانے کے راز سے واقف ہیں۔ آپ کو یہ احساس تو ہو گا کہ میں نے آپ کی کشتی عزت افزائی کی ہے۔ اپنی فوج کے سینڈائی تکہ کو اس راز میں شریک نہیں کیا اور آپ یہ بھی سوچیں کہ شکستہ رانی سے مجھے کتنا پیار ہے مگر میں نے اسے بھی نہیں بتایا کہ میں تمام تر خزانہ قلعے کے قریب اور منتقل کر دیا ہوں۔“

”ہمارا راجا کو مجھ پر کسی قسم کا شک نہیں کرنا چاہیے۔“ پنڈت نے کہا۔
 ”میں آپ کا خزانہ اُس روز سے اس غاریں نے جارہا ہوں جس روز سے یہاں اطلاع پہنچی ہے کہ غزنی کے سلطان محمود نے سترہ ہزار بھی قبضہ کر لیا ہے اور اب اُس کا راجہ قنوج کی طرف ہے۔ آپ خود جا کر وہ جگہ دیکھ آئے ہیں جو میں نے اس پہاڑی

کے اندر بنوائی ہے۔ راج محل میں بھی کسی کو پتہ نہیں چل سکا کہ ایک رات آپ میرے ساتھ رہاں گئے تھے۔۔۔۔۔ آج میں نے آپ کے زور و دھن کی اسخری کھپیپ بھی اُس جگہ پہنچا دی ہے۔“

”اُس کی حفاظت کا انتظام مکمل ہو گیا ہے؟“
 ”اتنا مکمل کہ اب آپ بھی وہاں اکیلے جائیں تو شاید وہاں سے زندہ نہیں نکل سکیں گے۔“ پنڈت نے کہا۔ ”وہاں پہرے پر کوئی ایک بھی انسان نہیں سنبھال رہا ہے۔“

”مجھے ایک بات اور کہنی ہے۔“ ہمارا راجا نے کہا۔ ”اگر یہ راز فاش ہو گیا تو وہ دن آپ کی زندگی کا آخری دن ہو گا، اور اگر اس سے پہلے میری سمیت آگئی تو آپ کو میرے ساتھ مرنا ہو گا۔“

پنڈت کے ہونٹوں پر طنز آ کر مسکراہٹ آگئی۔ ہولانہ زندہ جواہرات کا نشہ اتنا بڑا ہوتا ہے کہ انسان درندہ بن جاتا ہے۔ اپنے بیوی بچوں کو اور اپنے منہ بے ہوش پڑھانوں کو بھی اپنا دشمن سمجھنے لگتا ہے۔ جو دولت میرے پاس ہے، اس کے سامنے میری دل اور سونے کی چمک کوئی سمی نہیں رکھتی۔ میرے بھجن، میری براہمنا اور ہری کرشن کے چرلوں میں راتوں کو جاگنا وہ دولت ہے کہ آپ جیسے ہمارا ہے اور ان کی فوجیں مجھے جینوئیسوں کی طرح دکھائی دیتی ہیں۔“

”اسی لیے تو میں نے آپ کو اپنا راز دان بنایا ہے۔“ ہمارا راجا پال نے کہا۔

تمام موصوفین نے جن میں محمد قاسم فرشتہ اور البر وئی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ لکھا ہے کہ محمود غزنوی کو بتایا گیا تھا کہ اُس کا مقابلہ قنوج میں ہو گا۔ قنوج کے حکمران خاندان کے متعلق سلطان محمود نے ایسی باتیں کہیں کہ اُس پر عجیب کی قسم کی تجدید ظاہری ہو گئی تھی۔ غزنی سے اُسے کمک ملنے کی توقع نہیں تھی۔ وہ ایسی چالیں سوچتا رہتا تھا جن سے قنوج کی فوج کو شکست دے کے سترہ ہزار اُس نے اپنی فوج

مہاراج راجیا پال نے کلمہ ”وہ فتوح کا خزانہ نہیں بے جا سکے گا۔ وہ مجھے تیر نہیں کر سکے گا۔ یہاں پاگلوں کی طرح ہمارا خزانہ ڈھونڈتا رہے گا۔ اُسے کچھ بھی نہیں ملے گا۔ اُسے میں بھی نہیں ملے گا۔ میں داں ہوں گا جہاں اُس کی پوری فوج بٹھے نہیں ڈھونڈ سکے گی۔“

”اُسے مندر مل جائیں گے۔“ پنڈت نے کہا۔ ”وہ مندروں کو اجاڑے گا اور ہم کھڑے دیکھتے رہیں گے۔ مہاراج از در جواہرات کے بیارنے آپ کو بزدل بنا دیا ہے۔ آپ غزنی کے سلطان کو دھوکہ دینے کی سوچ رہے ہیں مگر یہ بزدل ہے۔ آپ اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ اپنی فوج کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ آپ نہیں سمجھتے کہ جب آپ یہاں سے چوری چھپے بھاگ کر کہیں چلے جائیں گے تو آپ کی فوج اور رعایا کے دل میں آپ کے خلاف نفرت پیدا ہو جائے گی۔۔۔۔ میں بھگوان کے نام پر آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنا فیصلہ بدل دیں۔ فتوح کا پتہ پوچھ لڑنے مرنے کے لیے تیار ہے۔ انہیں مسلمانوں کے خلاف لگے گئے گجرات کے گجراتیوں کا نام ہے۔“

”مجھے سوچنے دیں۔“ مہاراج راجیا پال نے کہا۔ ”مجھے سوچنے دیں۔“ وہ پریشان ہو گیا اور بے چینی کے عالم میں کہنے لگا۔ ”میں نے کچھ سوچ کچھ فیصلہ کیا ہے۔ آپ چلے جائیں۔ میں آپ کو ہر ایک بات نہیں بتا سکتا۔“

پنڈت کے جانے کے بعد مہاراج فتوح راجیا پال نے اپنی فوج کے سپر کمانڈر کو بلایا اور انہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ بظاہر بزدل ہے کہیں غزنی والوں کا مقابلہ نہیں کروں گا، لیکن میں نے سوچا ہے کہ میں غائب ہو جاؤں گا۔ یہ حملہ کے لیے بہت بڑی چوٹ ہوگی۔ وہ فتوح میں پاگلوں کی طرح سرخوٹا پھرے گا۔ وہ اچھی میاں سے جائے گا نہیں۔ اس کا مقابلہ ابھی کسی نے بھی نہیں کیا۔ اُسے ہر جگہ آسان فتح حاصل ہوتی ہے۔ میں نے سوچا ہے کہ لڑاؤ کو ادیشہ می کرتے کرتے اُس کی طاقت بہت کم ہو جائے گی۔ میں اس عرصے میں دوسرے مہاراجوں

کو بہت آرام دے لیا تھا مگر سالاروں اور نائب سالاروں کو اُس نے جہنم سے بیٹھے نہیں دیا تھا۔ اپنی فوج کا مورال بلند کرنے کے لیے اُس نے اماموں کے ذریعے تمام فوج کو پیغام بھی دیا تھا۔

یہ اُس کے جذبے کا جنون اور عزم کی پختگی تھی کہ وہ یکے بعد دیگرے اتنے قلعے سر کر کے اور اتنے معرکے لڑ کر بھی آگے بڑھنے کا فیصلہ کر چکا تھا، مگر فتوح کے متعلق اُسے جو رپورٹ مل تھی وہ صحیح نہیں تھی۔ مہاراج فتوح راجیا پال نے اپنا خزانہ فتوح سے کسی پہاڑی علاقے میں منتقل کرنا شروع کر دیا تھا۔ مورخین نے لکھا ہے کہ محمد غزنوی کی پہلے پہلے فتوحات اور اس کی برق رفتار بغاوت کو دیکھ کر راجیا پال حوصلہ چھوڑ بیٹھا تھا۔ فتوح کے بڑے مندر کا پنڈت اُسے لڑنے کے لیے تیار کر رہا تھا مگر اُس کے پاس نہ لڑنے کی ایک وجہ اور بھی تھی جو اُس نے پنڈت کو نومبر ۱۸ء کی اس صبح اپنی خواب گاہ میں بتائی۔

”مہاراج کا خزانہ محفوظ ہو گیا ہے۔“ پنڈت اسے کہہ رہا تھا۔ اب آپ سلطان محمود کا مقابلہ کر کریں، در نہ فتوح کا منہ بھی مسجد بن جلے گا۔ یہ نہ بھولیں کہ جنہیں مسلمان بُت کہتے ہیں وہ ہمارے بھگوان ہیں۔ ان کی جوگوہیں ہو چکی ہے وہ آپ نے دیکھ لی ہے۔ میں آپ کو خبر دے رہا ہوں کہ آپ دیوی دیوتاؤں کے تہرے بیچ نہیں سکیں گے۔“

مہاراج نے پنڈت کو طنزیہ نگاہوں سے دیکھا اور دھمکی کی آواز میں بولا۔ ”جنہیں آپ دیوی دیوتا کہتے ہیں یہ دراصل بُت ہی ہیں۔ اگر ان میں تہر ہر سانس کی طاقت ہے تو اپنی بے عزتی کی سزا مسلمانوں کی فوج کو کیوں نہیں دیتے؟ وہ مٹھ لیں اذانیں دینے والوں پر نکل بن کر کیوں نہیں گرتے؟“

”مسلمانوں کی فوج دراصل دیوتاؤں کا تہر ہے جو اس دس کے اُن مہاراجوں پر بڑ رہا ہے جو اپنے مذہب کی توہین کر رہے ہیں۔“ پنڈت نے کہا۔ ”مگر آپ مذہب کی بجائے اپنے خزانوں کی حفاظت کر رہے ہیں۔“

”وہ اس لیے غزنی کا سلطان خزانے ٹوٹ کر غزنی بے جانے کے لیے آئے ہیں۔“

”میں جانتا ہوں غزنی کا سلطان محمود تنوچ کو کھنڈر بنا دے گا۔“ خاندنہ راجا پال نے کہا۔ لیکن یہی کھنڈر اُس کی قبر بنیں گے اور ان کھنڈروں سے نیا تنوچ ابھرے گا جو ہندو مت کا محافظ ہوگا۔۔۔ میں آپ سب کو یہ بتانا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ تنوچ کو پتہ نہ چلے کریں نے کیا فیصلہ کیا ہے؟ تمام کمانڈر سر جھکائے ہوئے باہر نکل گئے۔

آدھی رات سے کچھ دیر پہلے پنڈت عبادت میں مہر دیا تھا۔ یہ دقت اُس کی عبادت کا نہیں تھا لیکن ہمارا تنوچ کے فیصلے نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ اسے اب یہی نظر آ رہا تھا کہ سلطان محمود آئے گا اور اس سند کو اجاڑ کر اُس کے دیوتاؤں کے بت توڑ دے گا۔ پنڈت اُس وقت سے ڈر رہا تھا اور دیوتاؤں سے کہہ رہا تھا کہ وہ سلاٹوں کو تنوچ سے دوری فنا کر دیں۔ وہ دیا بھی تھا اور بڑی دودنکی آواز میں بھجن گارہا تھا۔ اُس کا دروازہ کھلا گروہ عبادت میں آنا چھوٹا تھا کہ اُسے پتہ چل سکا کہ اُس کے قریب کوئی آگے بیٹھ گیا ہے۔ وہ اُس وقت چونکا جب اُس کے کندھے پر کبھی نے ہاتھ رکھا۔ اُس نے دیکھا۔ اُس کے قریب ہمارا تنوچ کی چھوٹی رانی شکنتلا بیٹھی تھی۔

”آپ؟“ پنڈت نے حیران ہو کر پوچھا۔ اُس دقت؟۔۔۔ وہ سنبل گیا اور بولا۔

”پہلے دیوی کے چرنوں میں ماتھا گرڑیں؟“ رانی شکنتلا نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہ ہو۔ وہ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے تھی۔ پنڈت نے اپنے جسم میں سسکی کی لہر دوڑی محسوس کی۔ ایک اس لیے کہ وہ شکنتلا رانی تھی اور دوسرے اس لیے کہ شکنتلا کے جن میں جانکا اثر تھا۔ پنڈت کا دل اس سوال سے بڑی زبردستی سے دھڑکنے لگا کہ رانی اس وقت منذر میں کیوں آئی ہے، وہ عبادت کے لیے نہیں آئی تھی۔ اُس کا انداز بتا رہا تھا کہ کبھی خاص قصہ کے لیے آئی ہے۔

”آپ کے چہرے پر گھبراہٹ کیوں آگئی ہے؟“ رانی شکنتلا نے کہا۔ کیا مجھ

کو ساتھ ملا کر بڑی زبردستی تنوچ بنا لوں گا۔ پھر یہی تنوچ سلطان محمود اور اس کی فرج کا قبرستان بن جائے گا۔“

وہ سلطان محمود غزنوی کا مقابلہ نہ کرنے اور غائب ہو جانے کے حق میں جواز پیش کرتا رہا مگر اس کے فوجی کمانڈروں کے چہرے بتا رہے تھے کہ وہ اپنے ہمارا جب کے فیصلے کو پسند نہیں کر رہے۔ ان میں سے کوئی کبھی نہ بولا۔ سب بت بنے سنبھلے رہے۔

”کیا آپ سب کو میرا فیصلہ منظور ہے؟“ اُس نے سب سے پوچھا۔

”ہم آپ کے حکم کی تعمیل کریں گے۔“ اُس کے سینا پتی (کمانڈر انچیف) نے کہا۔ ”مگر ہم میں سے کوئی بھی اپنی زبان سے یہ نہیں کہے گا کہ وہ نہیں لڑے گا۔ ہمارا ج! یہاں سوال آپ کے یہاں رہنے یا غائب ہو جانے کا نہیں۔ یہاں مسئلہ مذہب کا ہے۔ اس جنگ کا تعلق براہ راست مذہب سے ہے۔ اگر ہندو راجے ہوں میدان چھوڑ کر بھاگنے لگے تو سارا ہندوستان مسلمان ہو جائے گا۔“

ہمارا راجا پال نے ایک کاغذ کھول کر اپنے سینا پتی کو دے کر کہا۔ ”یہ سب کو پڑھ کر سناؤ۔“

یہ لامبور کے ہمارا ج بھی پال مندر کا خط تھا جو اُس نے منج کے رائے چند کو لکھا تھا۔ رائے چندا نے یہ خط تنوچ کے ہمارا راجا پال کو بھیج دیا تھا۔ بہت سے مورخوں نے اس خط کا ذکر کیا ہے۔ ان کے مطابق ہمارا ج بھی پال مندر نے رائے چند کو لکھا تھا۔ ”سلطان محمود ہندوستان کے حکمرانوں کی طرح نہیں۔ وہ سیاہ فام آدمیوں کا سردار نہیں۔ اُس کا نام سن کر ہی فوجیں اُس کے آگے بھاگ اٹھتی ہیں۔ اُس کے گھوڑے کی نگام آپ کے گھوڑے کی نگام سے زیادہ مضبوط ہے۔ وہ انداز کے ایک ہی فار سے سٹپس نہیں ڈا کرتا اور وہ سلسلہ کوہ میں سے صرف ایک پہاڑی نہیں یا کرتا۔ اگر آپ اُس سے محفوظ رہنا چاہتے ہیں تو بہن آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہیں چھپ جائیں۔“

رائے چندا نے یہ خط اس پیغام کے ساتھ ہمارا راجا پال کو بھیج دیا تھا کہ وہ لڑکر مرنے کو ترجیح دے گا۔ اُس نے یہ خط ہمارا راجا پال کو اس لیے بھیجا تھا کہ وہ اپنی قسمت کا خود فیصلہ کر لے۔

جیسی خوبصورت عورت پہلے نہیں دیکھی!۔۔۔ کیا میں اُن کنواریوں کے مقابلے میں کچھ نہیں جنہیں آپ منتخب کر کے اپنے پاس رکھا کرتے ہیں اور لوگوں کو یہ بتایا کرتے ہیں کہ یہ کنواریاں اب پاک ہو گئی ہیں؟

”آپ اپنا مطلب بیان کر دیں تو زیادہ بہتر ہوگا“۔ پنڈت نے کہا۔ آپ دیکھ رہی ہیں کہ میں عبادت میں مصروف ہوں؟

”ہمارا ج!۔ شکستہ لائے کہا۔ اگر ہم ایک دوسرے کو دھوکہ نہ دیں تو دونوں کے لیے بہتر ہوگا۔ آپ کس کی عبادت کر رہے ہیں؟ ان دیوتاؤں کی جو دونوں کے بہان ہیں؟ ہری کشن واسدیو نے مسلمانوں کا کیا بگاڑ لیا ہے؟ کنواریاں کی قربانی کہاں گئی؟ اُن مصوموں کا خون کس کھاتے میں گیا؟

”کیا آپ مجھے ہمارا ج کی طرح مذہب سے گمراہ کرنے آئی ہیں؟“
”نہیں۔۔۔ رانی شکستہ لائے کہا۔ میں آپ کو ہمارا ج بنانے آئی ہوں۔۔۔۔۔“
مجھے صرف یہ بتا دیں کہ خزانہ کہاں ہے۔ مجھے دہاں لے چلیں۔ ہم دونوں، میں اور آپ خزانہ لے کے کہیں چلے جائیں گے۔ ہو سکتا ہے میں آپ کو تنوع کی گدلی پر ہی بٹھا دوں۔“

”کیسا خزانہ؟۔۔۔ پنڈت نے کہا۔“ میں خزانے کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔“
”میں جانتی ہوں آپ اپنا عہد پورا کر رہے ہیں۔“ رانی شکستہ لائے کہا۔
”لیکن آپ کو مجھے اس راز میں شریک کرنا پڑے گا۔ مجھے مذہب سے اور دیوی دیوتاؤں کے تہ سے نہ ڈرنا۔ مذہب کو میں ایک فریب کے سوا کچھ نہیں سمجھتی۔ میں صرف خزانہ حاصل کرنے نہیں آئی۔ آپ کو بھی ساتھ لے جانے آئی ہوں۔“
”مذہب کوئی ساہی ہو، مذہب کو فریب سمجھنے والے اس دنیا میں کبھی سکھنی نہیں رہے۔“ پنڈت نے کہا۔ ”غریب کا سلطان کیوں فتح پر فتح حاصل کرتا جا رہا ہے؟ صرف اس لیے کہ اُسے اپنے مذہب سے اتنا پیار ہے کہ وہ سارے ہندوستان کو مسلمان بنا دینا چاہتا ہے۔ اس کے دل میں ہمارے مذہب کے خلاف نفرت بھری ہوئی ہے۔“

”ہمارا مذہب نفرت کے قابل نہیں تو اور کیا ہے؟۔۔۔ رانی شکستہ لائے کہا۔“
”ہمارا ج! میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ آپ ہمیں کہیں راتوں سے خزانہ کہیں نے جا کر چھپا رہے ہیں۔ آپ سمجھتے ہیں کہ اس ماز سے آپ اور ہمارا ج کے سوا کوئی دلف نہیں۔ آپ نہیں جانتے کہ مجھ سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں مگر آپ نے میری راہنمائی نہ کی تو آپ کو بہت بڑا نقصان ہوگا۔“

”کیا آپ اپنے طاقتور دھوکہ دینا چاہتی ہیں؟“
”ہمارا ج کسی ایک عورت کا خاندان نہیں ہوتا۔“ شکستہ لائے کہا۔ ”آج رات ہم کسی ابد کا غنڈہ ہے، اس لیے آپ کے پاس آنے کا موقع مل گیا ہے۔ ہمارا ج اُس وقت تک میرا خاندان ہے جس وقت تک میرا حسن و جوانی قائم ہے۔۔۔۔۔“
”ہمارا ج! انسان جب تخت پر بیٹھ کر سر پر سونے کا تاج سجالیتا ہے تو اُس کے اندر انسانی جذبات مر جاتے ہیں۔ وہ محبت اور خلوص سے خالی ہو جاتا ہے۔ ہمارا ج کو صرف خزانے سے محبت ہے۔ اسے ایسا کوئی غم نہیں کہ غریب کے فوجی مجھے اور مجھے جیسی تمام جوان اور خوبصورت عورتوں کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ وہ اپنے خزانے کی پکپکا چاہتا ہے۔ اُسے آپ کا اور آپ کے دیوتاؤں کا کوئی خیال نہیں۔ آپ اپنا خیال کریں اور آپ میری طرف دیکھیں۔“

”میں اس کے باوجود آپ کو خزانے کا راز نہیں دوں گا۔“ پنڈت نے کہا۔
”پھر آپ اغوا ہو جائیں گے۔“ شکستہ لائے کہا۔ ”آپ میری آنکھ کے اشارے پر قتل ہو جائیں گے لیکن میں آپ کو قتل نہیں کروں گی۔ آپ کی دونوں آنکھیں نکوا کر اور آپ کے جسم کی کھال کہیں کہیں سے کاٹ کر آپ کو جنگل میں چھوڑ دوں گی۔ اُس موت کو تصور میں لائیں جو آپ کو بڑی آہستہ آہستہ اس دنیا سے اٹھائے گی۔ اُس اذیت کا تصور کریں جو آپ کو آہستہ آہستہ تڑپا تڑپا کر بیسا مارے گی۔ آپ کے زخموں پر مکھیاں بیٹھیں گی اور جیو بیٹیاں چڑھیں گی۔ ہو سکتا ہے گیدھ آپ کو زندہ ہی توپنے لگیں۔“

پنڈت اس طرح چپ چاپ سن رہا تھا جیسے اُس کی زبان لنگ اور اُس

کے جسم کی طاقت سلب ہوگئی ہو۔ شکستہ لڑائی کی آنکھوں کی چمک جس میں جمن کا سر تھا۔ اب ایک چڑیل کی آنکھیں بن گئی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ، دھیمے دھیمے بول رہی تھی۔ ”امد اگر میں نے آپ پر رحم کیا تو میں دوسرا طریقہ اختیار کروں گی۔“ شکستہ لڑائی نے کہا۔ ”میں ہمارا ج سے کموں کی کہ آپ نے مندر میں بلا کر مجھ پر دست درازی کی ہے۔ میں گواہ بھی لے آؤں گی۔ میں اپنے جسم پر اپنے ہی ناخنوں سے خراشیں ڈال کر کموں کی کہ یہ آپ کے ناخنوں کی خراشیں ہیں۔ ہمارا آپ کی نہیں نہیں گے۔ وہ جاننے میں کہ ان مندر میں کیا ہوتا ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ ہر پنڈت اور ہر سادھو عورتوں کا شکری ہے۔۔۔۔ پھر آپ کو جلاؤ کے حوالے کر دیا جائے گا۔ یہ موت آپ کے لیے آسان ہوگی۔“

پنڈت کے جسم نے پھر جھری لی امد وہ بولا۔ میں نہیں خزانے تک لے جاؤں گا۔۔۔۔ کب چلوں گی؟

”ابھی۔“ شکستہ لڑائی نے کہا۔ لیکن یاد رکھیں کہ سارا ج تک یہ اطلاع پہنچی تو آپ کا انجام اسی ہو گا جو میں آپ کو بتا چکی ہوں۔ میں دس آدمی اور دس عورتیں ہمارا ج کے سامنے کھڑی کر کے ان سے کھڑاؤں گی کہ آپ نے خزانے کا لالچ دے کر مجھے اپنے ساتھ بھاگ چلنے کو کہا تھا اور میں آپ کو موقع پر گرفتار کرانے کے لیے فراہم نے تک ساتھ چلی گئی تھی۔

”خزانہ اٹھوانے کے لیے بہت سے آدمیوں کی ضرورت ہے۔“ پنڈت نے کہا۔ یہ انتظام خفیہ طریقے سے کیسے ہو گا؟

”میں آج رات صرف جگہ دیکھنا چاہتی ہوں۔“ شکستہ لڑائی نے کہا۔ سارا انتظام میرا ہو گا اور خفیہ ہو گا اور آپ کو میں اپنے ساتھ رکھوں گی۔ آپ کے ساتھ دھوکا نہیں ہو گا۔“

پنڈت اٹھ کھڑا ہوا۔

طلال ابراہیم امد صبح بروک نے رات چٹان پر گزاری تھی۔ صبح ہوئی تو تلال نے کہا کہ وہ اس شکاف کے اندر جانا چاہتا ہے۔ صبح نے اُسے کہا کہ سب سے پہلے

انہیں وہ کام کرنا چاہیے جس کے لیے وہ اُدھر آئے ہیں مگر تلال کی ضد کام کر گئی۔ پنڈت ان آدمیوں کو جن کی آنکھوں پر ٹپیاں بندھی ہوئی تھیں جس شکاف میں لے گیا تھا، دن کی روشنی میں ڈرنا نہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہاں سے چٹان نے عجیب سی شکل اختیار کر لی تھی۔ عمودی اور خاصی اونچی دیوار سی تھی۔ اس میں شکاف ایسے تھا جیسے کموں کی دیوار ایک طرف سے گرادی گئی ہو۔ اس میں سے پیچھے کی چٹان جو کموں کی تھی نظر آ رہی تھی۔ تلال اور صلاح اس کے اندر چلے گئے۔ یہ ایک وسیع کموں تھا جو قدرت نے زمین پر بنایا تھا۔ چٹان میں بھر بھی تھے مٹی بھی۔ اوپر کے درخت جھک کر اس پر سایہ کیے ہوئے تھے۔ دیواروں میں بھی درخت تھے جو اوپر چلنے کی بجائے زمین کے ساتھ متوازی ہو گئے تھے۔ ان کے سامنے اندھیرا سا کرکھا تھا۔ اس کموں کا جگہ میں پانی کھڑا تھا جو ابائی کم اور دلمل زیادہ تھی۔ اس کے کناروں اور چٹان کے درمیان چلنے کے لیے تھوڑا سا خشک راستہ تھا۔ تلال اور صلاح اس راستے پر چلتے چلتے آگے گئے تو سامنے دال چٹان کے واس میں مٹی کی ایک ٹیکری تھی۔ پنڈت کے آدمی یہیں کہیں غائب ہوئے تھے۔

دونوں ٹیکری پر چڑھے تو انہیں چٹان میں ایک دامنہ نظر آیا جو پھلے ہوئے ایک درخت اور بھاری نارختوں میں پھپھا ہوا تھا۔ وہ دامنہ میں چلے گئے۔ اندر کمرے کی طرح کا غار تھا جس میں آسانی سے کھڑا ہوا جاسکتا تھا۔ یہ گول سا کمرہ تھا۔ اندر اندھیرا اتنا تھا کہ کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ دونوں نے بہت ٹٹولا مگر دال مٹی اور پتھروں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک جگہ ایک اور دامنہ کھلا ہوا تھا جو دراصل سرنگ تھی۔ یہ اس قدر اندھیری تھی کہ کچھ پہنچنے چلا تھا کہ اندر کیا ہے۔

”اگر تم کیلے سیلن رہنا چاہو تو رہ سکتے ہو۔“ صلاح بروک نے تلال ابراہیم سے کہا۔ میں جاتا ہوں۔“

طلال بے دلی سے باہر کو چل پڑا۔ وہ بار بار پیچھے دیکھتا تھا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ اپنے زخموں کو بھول چکا ہے۔ جنگل کا یہ گوشہ کچھ پراسرار اور خوفناک سا تھا۔ صلاح بروک تلال کو اپنے ساتھ لے گیا اور دونوں پانچ چھ سیل دور ایک چٹان پر چڑھ گئے جہاں سے

انہیں منوج کا قلم اور شہر نظر آ رہا تھا۔ وہاں انہیں کوئی فوجی نقل و حرکت نظر نہیں آ رہی تھی۔

”سلطان منوج کے قریب پہنچ چکا ہو گا۔ صابح نے کہا۔ اُمیدیں کچھ نظر نہیں آ رہی۔ ہم دو آدمی پیدل کتنے علاقے کو دیکھ سکتے ہیں؟“ طلال نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے منوج کی فوج رات کو کسی اور راستے سے منوج کے قریب چلی گئی ہو۔“

”ہر جگہ ہمارے آدمی موجود ہیں۔“ صابح نے کہا۔ ”میں یقین سے کہتا ہوں کہ منوج سے فوج باہر نہیں نکلی۔“

وہ سارا دن گھومتے پھرتے رہے اور رات اُسی جگہ چلے گئے جہاں گزشتہ رات سوئے تھے۔ صابح نے طلال سے کہا تھا کہ وہ ساری رات وہاں گزریں گے۔ آدھی رات تک سوئیں گے۔ پھر منوج کے قریب چلے جائیں گے کیونکہ منوج کی نقل و حرکت کی توقع رات کو ہی کی جاسکتی تھی۔

دونوں اُسی جگہ چٹان کے اوپر لیٹ گئے۔ وہ اتنے تھکے ہوئے تھے کہ لیٹتے ہی سو گئے۔

آدھی رات سے ذرا پہلے صابح بروک کی آنکھ کھل گئی۔ اُسے گھوڑوں کے قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اُس نے طلال ابراہیم کو جگایا گھوڑے قریب آ رہے تھے۔ ذرا دیر بعد روشنی نظر آنے لگی۔

”ہمارا کام ہوتا نظر آ رہا ہے۔“ صابح نے کہا۔ ”یہ آوازیں دیہاتیں گھوڑوں کی ہیں۔ فوج آ رہی ہوگی۔“

دونوں پیٹ کے بل ریگ کر آگے ہو گئے جہاں سے وہ کسی کو نظر آئے بغیر نیچے دیکھ سکتے تھے۔ انہیں دو گھوڑے آتے دکھائی دیئے۔ ایک سوار کے ہاتھ میں جلتی جھولی مشعل تھی۔ وہ قریب آئے تو طلال نے کہا۔ ”میرے کل رات والا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ وہ دوسری عورت ہے۔“

”لوٹتے بھیو۔“ صابح نے کہا۔ ”اُن کا فوج کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔“

وہ سوار کواں ناپٹان کے سنگاف میں آڑے اور ادھر ادھر دیکھ کر گھوڑے اندر لے گئے۔ ایک تو پنڈت تھا اور دوسری شکستہ لانی تھی۔ وہ اندر جا کر غار کے دبانے کے سامنے والی ٹیکری کے قریب رکے اور گھوڑوں سے اتر کر ٹیکری پر جا بیٹھے اور غائب ہو گئے۔

”میں تمہیں کہ رہا ہوں کہ چل کے دیکھتے ہیں یہ ہے کیا۔“ طلال نے صابح سے کہا۔ ”یہ ایک مرد اور ایک عورت ہے۔ تم نے عورت دیکھی ہے۔ یہ کوئی معمول کی قسم کی عورت نہیں۔ شہزادی معلوم ہوتی ہے۔“

صابح بروک کو پنڈت کے ساتھ دل چسپی تھی نہ عورت کے ساتھ لیکن طلال ابراہیم اتنی تیزی سے چٹان سے اتر گیا کہ صابح اُسے روک نہ سکا۔ وہ بھی اُس کے پیچھے نیچے چلا گیا۔ دونوں نے کچروں کے اندر ایک ایک تلوار اور ایک ایک خنجر چھپا رکھا تھا۔ لیکن تلوازیں نکال لیں اور ادھر سے میں دھمکے کنارے کنارے غار کے دبانے تک پہنچ گئے۔ اندر سے روٹی آ رہی تھی۔ پنڈت اور شکستہ لانی کے وہم دھماں میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ اُن کے سوا یہاں کوئی اور انسان موجود ہے۔ ان کی باتیں باہر سنائی دے رہی تھیں۔

”رانی!“ پنڈت کُڑ رہا تھا۔ خزانہ یہاں ہے۔ میں تمہیں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ واپس چلی جاؤ۔“

”یہاں تو کچھ بھی نہیں۔“ رانی نے کہا۔ ”کیا خزانہ اس فرش کے نیچے ہے؟“

”ادب میں نہیں قتل کر سکتا ہوں۔“ پنڈت نے کہا۔ ”تم نے مجھے دھکیا تو دی تھیں اور مجھے بھی ایک انعام سے ڈرایا تھا۔ اب بتاؤ تمہیں مجھ سے کون پیسہ کسے۔“

”تمہاری لاش ایسی جگہ چھپاؤں گا کہ کسی کو ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گی۔“

”ہوش میں آؤ پنڈت!“ رانی شکستہ لانی نے کہا۔ ”کیا اس تنہائی میں آپ مجھ پر جیسی عذبت کوڑوں کھرا سکیں گے؟“

”پنڈت جی سارا ج! میں پھر کہتی ہوں کہ اپنے آپ کو قریب نہ دو۔“

”مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ رانی!“ پنڈت کی آواز سنائی دی۔ ”کمی کر

مرد کے لیے بلانا چاہتی جو نوپور سے زور سے چخوڑے۔

”میں سداچ!“ شکستہ کی التجائی دی۔ ”خیر نکالو۔ ایک بار پھر میری بات سن لو۔“

ایسی آواز سی آئیں جیسے پنڈت نے شکستہ کو کیر لیا ہو۔ وہ اس طرح بول رہی تھی جیسے اپنے آپ کو اس سے بچانے کے لیے اس وسیع غاریں بھاگ رہی ہو۔

پنڈت اُسے پکڑنے کو دوڑ رہا تھا۔ شعل کا ڈنڈ زمین میں گڑا ہوا تھا۔ کمرہ ناغار روشن تھا۔ پنڈت رانی کے پیچھے دھڑتے دھڑتے مک گیا اور غار کے دامن کی طرف دیکھنے لگا۔ شکستہ رانی نے بھی اُدھر دیکھا اور رگ گئی۔ غار کے دامن میں دو آدمی جو لباس سے خانہ بدوش گذر رہے تھے، ہاتھوں میں تلواریں لیے کھڑے تھے پنڈت اور شکستہ پر جیسے سکہ طاری ہو گیا ہو۔ لڑائی اور صاف بھی خاموشی سے کھڑے رہے۔ ”تم یہاں کیلئے آئے ہو؟“ پنڈت نے سنبھلے ہوئے بڑے رعب سے کہا۔ ”چلے جاؤ۔ یہاں ہمارے بہت سے آدمی ہیں۔ تمہاری بولی بھی نہیں لیے گی۔“ ”خیر پھینک دو۔“ لڑائی ابراہیم نے دھیمی سی آواز میں کہا۔ ”اوہ دونوں آگے آؤ، اور ہمیں بتاؤ کہ یہاں کیا ہے اور یہاں کیا کر رہے ہو؟“

پنڈت کھیانی سی ہنسی منس کر بولا۔ ”ہم مسافر ہیں۔ قنوج جا رہے ہیں۔ یہ میری بیوی ہے۔ باہر ہمارے گھوڑے کھڑے ہیں۔ یہاں رات گزارنے کے لیے رک گئے ہیں۔“

صاف بروک نے آگے بڑھ کر پنڈت کے ہاتھ سے خنجر لیا اور اپنی تلوار کی نوک پنڈت کی شہرگ پر رکھ کر پوچھا۔ ”برج بتاؤ یہاں کیا ہے۔ ہم خود بھی ڈھونڈ سکتے ہیں۔ اس عورت میں تم زندہ نہیں رہو گے اور یہ عورت ہمارے قبضے میں ہوگی۔“ اُس نے شکستہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”اپنا انجام سوچ لو۔“

”یہاں خزانہ ہے۔“ شکستہ رانی نے کہا۔ ”میں نہیں منہ مالکا دھوٹا لے کر چلے جانا۔“

”ہاں؟“ پنڈت نے کہا۔ ”یہ ٹھیک کہتی ہے۔ یہاں خزانہ ہے۔“

”کہاں سے آیا ہے خزانہ؟“ لڑائی نے پوچھا۔ ”اوہ تم دونوں کون ہو؟“

”میں قنوج کے بڑے مزدور کا پنڈت ہوں اور یہ سداچ قنوج کی رانی ہے۔“

پنڈت نے کہا۔ ”اگر تم انعام وصول کرنا چاہتے ہو تو میں دے دوں گا مگر تم یہاں سے جانا پڑے گا۔“

”یہ فیصلہ ہم خود کریں گے کہ ہم چلے جائیں گے یا نہیں رہیں گے۔“ لڑائی نے

کہا۔ ”تم یہ بتاؤ کہ خزانہ کہاں ہے؟“

”اوہ۔“ شکستہ رانی نے مسک کر لڑائی کا ہاتھ پکڑا اور اُسے غار کے دامن کی طرف

لے جاتے ہوئے بولی۔ ”میں تمہیں بتاتی ہوں کہ خزانہ کہاں ہے۔“

لڑائی اُس کے ساتھ چل پڑا۔ صاف بروک نے اُسے روکا مگر لڑائی نے اُس کی

ایک زبانی اور شکستہ رانی کے ساتھ باہر نکل گیا۔ صاف فیصلہ نہ کر سکا کہ وہ کیا کرے۔ وہ

پنڈت کو اکیلے چھوڑنے میں خطرہ محسوس کر رہا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ اس کے کچھ آدمی قریب

ہوں اور یہ انہیں بلا لے۔ وہ لڑائی کو شکستہ جیسی حسین عورت کے ساتھ بھی نہیں چھوڑتا

چاہتا تھا۔ وہ شش درج میں بڑا ہوا پنڈت کے سامنے کھڑا ہوا۔ اسے یہ احساس پڑنا

کر رہا تھا کہ اُس کا ساتھی اگر زندہ واپس آگیا تو اُس پر اس عورت کا جادو سوار ہو چکا ہوگا۔

شکستہ اور لڑائی کچھ دیر بعد واپس آئے۔ لڑائی کا چہرہ اور اُس کی چال ڈھال

بتا رہی تھی کہ وہ باطل بدل گیا ہے اور اپنے فرض کو وہ دل سے اتار چکا ہے۔ اس نے

آئے ہی پنڈت سے کہا کہ وہ بتا دے کہ خزانہ کہاں ہے۔

صاف بروک نے گرج کر کہا۔ ”لڑائی! باہر نکلو یہاں سے!“

لڑائی نے صاف کی طرف دیکھا پھر پنڈت اور شکستہ رانی سے کہا۔ ”تم دونوں

دراں دیوار کے ساتھ بیٹھ جاؤ۔ اوہ وہ صاف کو ان سے دوسرے گئے۔ کہنے لگا۔

”میری بات غور سے سنو صاف بروک! میں اپنے فرض سے کوتاہی نہیں کر رہا ہوں تمہیں

دھوکہ نہیں دے رہا۔ یہاں سے ہم دونوں کو کچھ وصول ہو جائے تو کیا بُرا ہے؟“

”لڑائی!“ صاف نے کہا۔ ”تمہارے جسم سے مجھے اس ناپاک عورت کی بدبو

زیادہ اندر چلی گئی۔ اُس نے صاب کو بلایا۔ صاب نے کہا۔ ”مجھے تمہارے خزانے کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔“ اُس نے تلوار اُس کی طرف پھینک کر کہا۔ ”یہ لو۔ اپنے ہاتھ سے کر دو جو کرنا ہے۔“

پنڈت نے تلوار اٹھالی اور طلال کی تلوار کے قریب دیوار میں تار دی اور بلا۔
— تب تلوار دل کو دائیں طرف دباؤ۔

دونوں نے تلواریں ایک طرف دہائیں تو مٹی کا ایک گورا اور بہت بڑا تو وہ سا جو گل
سل کی شکل کا تھا، آہستہ آہستہ دیوار سے الگ ہونے لگا۔ اس سے پہلے بالکل پتہ
نہیں چلتا تھا کہ یہ سل خاتونہ یہاں ہے۔ زور لگانے سے یہ باہر کو گر پڑا اور ایک
سرنگ کا دھماکا نظر آنے لگا۔

”رائی! اس سرنگ میں داخل ہو جاؤ۔“ پنڈت نے شکستہ سے کہا اور طلال
کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”تم بھی اندر چلے جاؤ۔ میں مشعل لے کر تمہارے پیچھے
آؤں گا۔“ اُس نے صاب سے پوچھا۔ ”اور تم؟“
صاب نے سر ہلا کر کہا۔ ”نہیں۔“ اور پنڈت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

شکستہ رائی جھک کر تیزی سے سرنگ میں داخل ہو گئی۔ اُس کے پیچھے طلال
بھی اندر چلا گیا۔ پنڈت نے انہیں کہا کہ وہ اندر سے بے گھر آئیں۔ آگے بڑھتے
جائیں۔ صاب کا خیال تھا کہ پنڈت مشعل اٹھا کر اُن کے پیچھے جائے گا مگر پنڈت نے
مشعل کی طرف دیکھا تک نہیں۔ ذرا ہی دیر بعد سرنگ کے اندر بڑی زور کی سرسراہٹ
پھر دوبار دھمک سانی دی اور اس کے فوراً بعد شکستہ رائی کی گھٹی گھٹی پچھن سانی دینے
لگیں۔ پنڈت نے صاب کی طرف دیکھا اور اُس کی مسکراہٹ اور زیادہ پھیل گئی۔ اندر
سے طلال کی آواز آئی۔ ”صاب! نکالو یہاں سے مجھے۔“

صاب دھڑک کر آگے بڑھا تو پنڈت نے راستے میں آکر اُسے روک لیا۔ بولا۔
”تم نے کہا تھا کہ تیس خزانے کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ تم یہیں رہو تم جیسے آدمی
کوندہ رہنا چاہیے۔“

آزہی ہے۔ عورت میں ضرب یہ طاقت ہوتی ہے کہ وہ عورت ہے اور مرد کا مرد ہونا
اس کی کمزوری ہے۔ میں جانتا تھا وہ تیس باہر کیوں لے گئی تھی۔ تم کہتے ہو کہ تم مجھے
دھوکہ نہیں دو گے؟ ہمارے درمیان ایک عورت اور سونے کے چند ایک
ٹکڑے آگے تو ہم دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جائیں گے سلطان
موجود تو ہی کی فتح اور شکست کا اٹھنا ہم دونوں پر ہے۔“

”خود سے منو صاب بھائی!“ طلال نے کہا۔ ”ہم ہندوستان کے رہنے والے
ہیں۔ غزنی والے ہمیں کیڑتے ہیں، کیا اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے کا اتنا سا ہی
معاوضہ ہونا چاہیے جو ہمیں غزنی کی فوج سے ملتا ہے؟“

”ہم نے جو فرض اپنے ذمے لیا ہے اس کا معاوضہ خدا دے گا۔ صلح ہو کر
نے کہا۔ تم اپنے آپ کو غزنی کی فوج کا ملازم نہ سمجھو۔ ہم اسلام کے مجاہدین ہیں۔“

”آتا خزانہ چھوڑ صاب۔“

”اپنا حلف یاد کرو۔“ صاب نے کہا۔ ”ہم نے قرآن مجید ہاتھ میں لے کر حلف
اٹھایا تھا کہ جان پر کھیل کر فرض ادا کریں گے اور دھوکہ نہیں دیں گے اور ہمارے
قدموں میں خزانے رکھ دیئے گئے تو ہمیں قبول نہیں کریں گے اور ایمان کے پکے
رہیں گے۔ ... طلال! موت کا کوئی کھوڑا سر نہیں کب آجائے۔ یہ خزانے دنیا میں
دھرے رہ جائیں گے۔“

”مجھے آرمینیا۔“ طلال نے کہا۔ ”تم یہیں رہو۔ مجھے یہاں سے کچھ وصول کر
لینے دو۔“

طلال نے پنڈت سے کہا۔ ”اٹھو اور مجھے خزانے تک لے چلو۔“

”ہاں ماراج!“ شکستہ رائی نے بھی پنڈت سے کہا۔ ”اب ہم زیادہ دیر
انتظار نہیں کر سکتے۔“

پنڈت نے اٹھ کر غار کی دیوار پر ایک جگہ انگلی رکھی اور طلال اور صاب سے
کہا۔ ”دونوں تلواریں جھینوں کی طرح یہاں مارو۔“
صاب کھڑا۔ طلال نے آگے بڑھ کر اُس جگہ تلوار ماری تو تلوار نصف سے

سرنگ کے دُور اندر سے شکستلارانی اور طلال ابراہیم کی چیخ و پکار سنائی دے رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کنوئیں میں چیخ چلا رہے ہوں۔ صراح بروک حیرت زدہ تھا کہ یہ کیا ہے۔ وہ جب چاب پنڈت کو دیکھے جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اُس نے پنڈت سے پوچھا کہ وہ دونوں کیوں چلا رہے ہیں۔ پنڈت نے فرش میں گڑی ہوائی مشعل اٹھائی اور صراح سے کہا کہ وہ اُس کے پیچھے رہے۔ وہ خود مشعل آگے کر کے سرنگ میں چلا گیا۔ صراح اُس کے پیچھے گیا۔ پندرہ بیس قدم آگے جا کر پنڈت ٹوک گیا اور صراح سے کہا کہ وہ اُس کے پیلو میں آجائے اور اس سے آگے دُرا سا بھی نہ بڑھے۔ پنڈت نے مشعل نیچے کر دی۔

صراح بروک نے آگے ہو کر دیکھا۔ دیاں ایک کنوئیں تھا جو دراصل بڑا گہرا گڑھا تھا۔ اس میں سے شکستلارانی اور طلال کے کراہنے کی آوازیں آرہی تھیں جو دہتی جارہی تھیں۔ ”چلو۔ اب میاں سے نکل چلو۔“ پنڈت نے صراح سے کہا۔ وہ سرنگ سے نکلے تو پنڈت فرش پر بیٹھ گیا اور بولا ”میرے سامنے بیٹھ جاؤ اور دستوں کی طرح باتیں کریں!“

”پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ یہ سب کیلئے؟“ صراح نے پوچھا۔ ”تم نے تو انہیں خزانہ نکالنے کے لئے اندھ بھاگھا!“

”پہلے تم بتاؤ کہ تم کون ہو؟“ پنڈت نے صراح بروک سے پوچھا۔ ”اگر تم نہیں بتانا چاہتے تو میں بتا دیتا ہوں کہ تم کون ہو۔ تم مسلمان ہو اور تم ہندوستان کے مسلمان ہو اور تم غزنی کی فوج کے جاسوس ہو... کیا میں نے غلط کہا ہے؟“ ”آپ نے ٹھیک کہا ہے۔“ صراح نے کہا۔ ”اب آپ میرے سوال کا جواب دیں۔“

”جس گھر نے گڑھے میں یہ دونوں گھرے ہیں ان میں ہندوستان کے سب سے زیادہ زہرے سانپ ہیں جو ان دونوں کو ختم کر چکے ہیں۔“ پنڈت نے کہا۔ ”یہ گڑھا میں نے کھودیا تھا اور اس میں سانپ بھی میں نے ہی چھوڑے تھے۔ اس گڑھے کے اوپر میں نے سر کندے رکھ کر اوپر مٹی ڈال دی تھی۔ اگر یہ دونوں مشعل لے کر جاتے تو بھی گڑھے میں گرتے کہو کہ مٹی انہیں پتہ نہ چلنے دیتی کہ پختہ سر کندے اور ان کے پیچھے

زہریلی موت ہے۔“
”خزانہ کہاں ہے؟“

”اسی جگہ ہے۔“ پنڈت نے کہا۔ ”اگر اسی سرنگ سے خزانے تک پہنچنا ہو تو گڑھے پر رکڑی کا تختہ رکھ کر اُس پر چل کے آگے جانا ہو گا۔ ایک راستہ محفوظ بھی ہے۔“ ”مجھے راستہ نہ بتاؤ۔“ صراح نے کہا۔ ”وہ نہ میں اپنے راستے سے ہٹ سک جاؤں گا۔“

”خود سے سو میرے دوست!۔“ پنڈت نے کہا۔ ”میں آپس بڑے کام کی ایک بات بتانا چاہتا ہوں اور یہ بات اس لیے بتا رہا ہوں کہ تم میں طمع نہیں۔ کہتے ہیں کہ جہاں خزانہ دفن ہوتا ہے وہاں سانپ ضرور ہوتا ہے جو خزانے کی رکھوالی کرتا ہے.... یہ بالکل غلط ہے۔ کہنے والوں نے بول کہا تھا کہ خزانہ زہرے سانپ کی طرح زہر ملا ہوتا ہے۔ جس نے خزانہ حاصل کر لیا وہ سانپ بن جاتا ہے۔ وہ اس دُور سے کو کوئی اُس سے خزانہ چھین نہ لے وہ ہر کسی کو ڈتا پھرتا ہے۔ میرے دوست! تم ابھی جوان ہو۔ تم نے دنیا نہیں دیکھی۔ میرا تجربہ ہے کہ جس کے دل میں زہرہا ہوتی ہے وہ انسان نہیں رہا۔ اس گڑھے میں جو سانپ ہیں وہ انسان کے گناہ ہیں۔ ان میں ایک کا نام حرص ہے۔ دوسرے کو ہوس کہتے ہیں تیسرے کو ریاکاری کہہ لو۔ ہر سانپ ایک گناہ ہے۔ یہ سارے سانپ انسان کے اندر اور پاؤں کے نیچے ریگتے رہتے ہیں۔ انسان مذہب سے خوف ہو کر جب یہ سوچ لیتا ہے کہ اُسے سونا اور ہیرے مل گئے تو وہ دنیا کو زیر کر لے گا تو وہ عقل کا اندھا ہو جاتا ہے۔ دُرا سا اشارہ ملے پر وہ دُڑ پڑتا ہے اُس گڑھے میں جا کر تا ہے جہاں اُس کے گناہ اُسے دس بیٹے ہیں۔ یہ خزانہ میں بھی نکال سکتا تھا۔ میرے سوا اس کا راز کسی کو معلوم نہیں جس کا یہ خزانہ ہے اسے بھی معلوم نہیں البتہ جب سے یہ راز میرے سینے میں آیا ہے میں رات رات بھر عبادت میں مصروف رہتا ہوں کہ میں گمراہ نہ ہو جاؤں۔“

”اگر تہا راندہب سچا ہوتا تو کبھی گمراہ نہ ہوتے۔“ صراح نے کہا۔ ”مجھے دیکھو یہ تم نے بتا دیا ہے کہ سانپوں والے کنوئیں پر تختہ رکھ کر خزانے تک جاسکتے ہیں مگر مجھے اس خزانے

میں چلا گیا ہے جو سانپوں والے کنوئیں تک جاتی ہے۔
 ”دیکھو تم کہاں ہو؟“ پنڈت نے کہا، ”تمہارے پیچھے بھی موت ہے آگے
 بھی موت ہے۔ تمکو زندگ چاہتے ہو یا موت؟“
 ”میں خزانے کے لیے نہیں مر رہا۔“ صاحب بروک نے کہا، ”دشمن سے لڑتے
 ہوئے مر رہا ہوں۔ مجھے یہی موت چاہیے۔ آگے آؤ پنڈت بہتر لڑوں گا۔“
 پنڈت نے سنس کر کہا، ”باہر آ جاؤ۔ تم نہیں مرد گئے۔“ اور پنڈت
 سرنگ سے باہر نکل گیا۔

صاحب بروک شکست خوردہ ساہو کے سرنگ سے باہر آیا۔ پنڈت نے مشعل
 کا ڈنڈا زمین میں گاڑ دیا اور تلوار پھینک کر بیٹھ گیا۔ اُسے جیسے خطرہ نہیں تھا کہ صاحب اس
 پر حملہ کرے گا۔

”بیٹھ جاؤ۔“ اُس نے صاحب سے کہا۔
 ”تم نے مجھے قتل کیوں نہیں کیا؟“ صاحب نے بادقار لمبے میں پوچھا۔ مجھے
 دھکیلے ہوئے سانپوں کے کنوئیں میں کیوں نہ گرنے دیا؟“
 ”کیونکہ میرے دل نے تمہیں پسند کیا ہے۔“ پنڈت نے کہا، ”تم میری طرح
 فرض شناس ہو اور تمہارے دل میں اپنے مذہب کا احترام ہے، اندوہا برات کا
 لہجہ نہیں۔ مجھے جنگ وجدل سے نفرت ہے۔ میں مذہب کا پرستار ہوں لیکن یہاں
 ہوں۔ تم لے رکھ لیا ہے۔۔۔ ہم نے جس طرح خزانے کو ٹھکرایا ہے اس کا میں تمہیں
 انعام دینا چاہتا ہوں۔“

”اگر تم مجھے انعام دینا چاہتے ہو تو وہ چیز دو جو میں مانگوں۔“ صاحب نے کہا۔
 ”مجھے اس خزانے میں سے ذرا سا بھی انعام نہیں چاہیے۔“ جو تمہارے یہاں چھپد کھلے ہے۔
 ”بولو کیا مانگتے ہو؟“ پنڈت نے کہا۔

”تنہا کی فوج سلطان محمود سے کہاں لڑے گی؟“ صاحب نے پوچھا۔
 ”قلعے میں محصور ہو کر رہا کرنا۔“

کا زرا سا بھی خیال نہیں آ رہا۔ میری نظریاتے فرض پر ہے اور میری ایک بات غور سے
 سن لو پنڈت! میں اپنا فرض تم سے پورا کر دے گا۔ میں نے خزانے پر ہاتھ رکھ کر اند
 خدا کو حاضرِ ناظر جان کر قسم کھا رکھی ہے کہ اپنے فرض پر خزانے اور اپنی جان و قرآن کو دوں
 گا۔ تنہا ہی جان میری مکھی میں ہے۔ اگر تمہارے مجھے ان سوالوں کے جواب نہ دیے
 جو میں پوچھوں گا تو میں تیس سانپوں کے کنوئیں میں پھینک دوں گا۔“

”سہی! تم اپنے آپ کو اس قدر بہادر اور عقل مند سمجھتے ہو؟“ پنڈت نے کہا۔
 صاحب سنس پر لنگر اُس کی ہنسی فوراً کھ گئی۔ پنڈت نے بھل کی سی پھرتی کا مظاہرہ
 کیا تھا۔ اُس نے ایک ہاتھ میں مشعل لے لی تھی اور اُس کے دوسرے ہاتھ میں تلوار
 تھی۔ مشعل کا ڈنڈا تلوار سے زیادہ لمبا تھا۔ پنڈت اتنی تیزی سے اٹھا تھا کہ صاحب کو
 ہٹنے کی بھی مہلت نہیں ملی تھی۔

”تمہارے پاس تلوار ہے۔“ پنڈت نے اُسے للکارا۔ ”آؤ۔ تم اپنا فرض ادا
 کرو۔ میں اپنا فرض ادا کرتا ہوں۔“

صاحب بروک تلوار سونت کر اُس کی طرف بڑھا اور اُس نے جب وار کیا تو پنڈت
 نے جلتی ہوئی مشعل اتنی آگے کر دی کہ صاحب کا چہرہ جھلنے لگا اور اس کی آنکھیں
 بند ہو گئیں۔ پنڈت نے چلا کر کہا، ”بھو میرے واسے۔“ صاحب اچھل کر نیچے ہٹ گیا۔
 پنڈت نے کہا، ”میں تمہیں لڑنے کا پورا موقع دوں گا۔ اپنا فرض ادا کر لو۔“

صاحب بروک نے پتیرا بدل کر حملہ کیا مگر پنڈت اس کے ہر وار سے پہلے مشعل
 آگے کر دیتا تھا۔ صاحب نے مشعل بردار کر لے شروع کر دیے مگر پنڈت نے ہر وار سے
 مشعل پھالی۔ وہ ابھی حملہ نہیں کر رہا تھا۔ صاحب دائرہ دار کے جارہا تھا۔ اُس کے دون
 مار غار کی دیوار پر پڑے۔ اچانک پنڈت نے اُس پر تابڑ توڑ وار شروع کر دیئے۔

صاحب نے ہر وار تلوار پر دھکا مگر مشعل اُسے پیچھے ہٹا رہی تھی۔ پنڈت نے ایک وار
 ایسا کیا کہ صاحب کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی۔ وہ تلوار اٹھانے لگا تو پنڈت کا ایک
 اور وار پچانے کے لیے مچھ گیا۔ پنڈت نے مشعل اُس کے چہرے کے قریب ک
 تو صاحب پیچھے ہٹا۔ وہ پیچھے پیچھے ہٹ رہا تھا۔ وہ دیکھ نہ سکا کہ وہ اُس سرنگ

اب اُس کی اپنی فوج متعلقہ کے قابل نہیں رہی۔ ہمارے ہمارا جوں نے اُسے موقع دیا ہے کہ وہ قنوج کے جال تک آجائے۔ وہ آ رہا ہے۔ جاؤ اور اُسے روک دو اُسے کھوکھلاؤں کا ناحق خون بہانے اور بروہی سپاہیوں کو یہاں لاکر مرنے سے باز آجاء اور یہاں زندہ جٹنے کی بجائے غزنی جاکر بادشاہوں کی طرح مرو۔

وہ باز بھی آئے۔ باہر دو گھوڑے کھڑے تھے۔ پنڈت نے صلیح بروک سے کہا کہ ایک گھوڑا شکستہ رانی کا ہے جو اندھیری پڑی ہے اس لیے یہ گھوڑا صلیح لے جائے۔

اگلے روز پنڈت ہمارا قنوج راجپال کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے ہمارا ذکر بتایا کہ اُس کی چیتی رانی شکستہ کو غزا کھا گیا ہے۔ اُس نے پوری تفصیل سے اُس کی لانی کی موت کا واقعہ سنایا۔ ہمارا پرچہ اس کا کچھ اثر نہ ہوا ہو۔ اُس کے ہنٹوں پر سرکسٹ آگئی اور اُس نے پنڈت کو غزنی میں پیش کیا۔

”میں نے ایک اور حکم نامہ کر دکھایا ہے۔ پنڈت نے ہمارا ذکر سے کہا۔ رانی کے ساتھ غزنی کے ایک جاسوس کو بھی سانپوں کے کونوں میں پھینک دیا ہے اور ایک اور جاسوس کو دھوکہ دے کر زندہ رکھا اور یہ بتا کر واپس جانے دیا ہے کہ اپنے سلطان سے کہہ دے کہ قنوج کا ٹرخ نہ کہئے۔ پنڈت نے صلیح بروک کو کچھ بتایا تھا وہ ہمارا راج راجپال کو سنا دیا اور کہا۔ میں نے آپ کی عزت کی خاطر آپ کو قنوج لانے کی خاطر اور اس سند کی عزت کی خاطر جھوٹا بلا ہے۔ میرے جھوٹ کو قنوج ثابت کر دیں۔ غزنی کو زمین سے اُٹھ دیں۔ وہاں تک کہلی نہیں پہنچ سکتا۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ میں نے سلطان محمود پر دہشت طاری کرنے کا انتظام کر دیا ہے۔ آپ اپنی کچھ فوج باہر بھیج دیں۔ ٹریس ہمارا راج اڑیں۔“

”ہمارا راج؟“ ہمارا راجپال نے کہا۔ آپ نے سلطان محمود کو اس کے ایک جاسوس کے ذریعے یہ غلط اطلاع دے کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اُس نے ہی خط جو بھیم پال منڈ نے رائے چند کو لکھا اور جسے چند نے راجپال کو بھیج دیا تھا پنڈت کے ہاتھ میں دے دیا۔ پنڈت خط پڑھ چکا تو ہمارا راج راجپال نے کہا۔ یہ اُس

منصور میرے سلطان دوست!۔ پنڈت نے کہا۔ ”ہم ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ مجھے آپس ایسی کوئی بات نہیں بتانی چاہیے جو میرے ملک کے نقصان کا اور سلطان محمود کی فتح کا باعث بنے لیکن میں صرف اس لیے تمہیں کام کی ایک بات بتا دیتا ہوں کہ تم ایمان اور اخلاق کے پکے ہو اور تمہیں اپنے فرض کے ساتھ پیار ہے۔ میں تمہیں بہت بڑا انعام دے رہا ہوں۔ ہمیں سے واپس چلے جاؤ اور اپنے سلطان سے کہنا کہ قنوج کا ٹرخ نہ کرے۔ ہمارا ہمارا عہد کر چکا ہے کہ وہ سلطان کو قنوج میں زندہ جلائے گا اور وہ گنگا اور جہانگ کے درمیان کا یہ علاقہ غزنی کی فوج کا قبرستان بنا دے گا۔“

”کیا تمہارے ہمارا ذکر کے پاس اتنی طاقتور فوج ہے؟“ صلیح بروک نے پوچھا۔ ”جب کوئی فوج اپنے دشمن کو فنا کرنے کا نتیجہ کر لیتی ہے تو وہ اپنی طاقت اور تعداد کو نہیں دیکھ کر کرتی۔ پنڈت نے کہا۔ قنوج کی فوج کا ہر ایک سپاہی غزنی کے سلطان سے ہر اُس سند کی توہین کا انتقام لینے کے لیے تیار ہو چکا ہے جو اُس نے یہاں آکر آجایا ہے۔ لیکن میرے دوست! ہمارا قنوج اکیلا نہیں۔ لاہور کے ہمارا بھی ہم پال منڈ کی فوج بھی پہنچ گئی ہے۔“

”کہاں ہے؟“

میرے نہیں بتاؤں گا۔ پنڈت نے کہا۔ میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ اپنے سلطان کو جاکر خبردار کر دو۔ وہ خوش ہو کر تمہیں انعام دے گا۔ اُسے بتاؤ کہ اس جنگل میں اُس کے لیے جال بچھایا جا چکا ہے۔ وہ اس جال سے نہیں نکل سکے گا۔ اُس کی فوج کا ہی انجام ہو گا جو یہاں کی فوج کا اُس کی فوج کے ہاتھوں ہوا تھا۔ یہاں کی فوج جن میں مذہب گئی تھی۔ اب غزنی کی فوج کو اس دریا میں ڈوبنا ہے۔ یہ پال منڈ کی فوج کے علاوہ دنیا کا ایک فوج آدمی ہے۔ یہ سہرا، بلند شہر، ماہن وغیرہ کی شکست خوردہ فوجوں کے بھگے ہوئے سپاہی ہیں جو قنوج میں آئے تو ان کی ایک فوج بنال گئی۔ یہ لوگ انتقام کی آگ میں جل رہے ہیں۔ تمہارے سلطان کو قنوج کے محاصرے کا موقع ہی نہیں ملے گا۔ اور میرے دوست! حقیقت یہ ہے کہ غزنی کے سلطان محمود کا مقابلہ کہیں بھی نہیں ہوا مگر

بھیم پال کا خط ہے جو اپنے آپ کو مذکور کہلاتا ہے۔ وہ اپنی ملاقاتوں میں ہے۔ اُس کا بیٹا تریچن پال بھی یہیں ہے گردہ میں فوجی مدد دینے کی بجائے غزنی کے سلطان کے خلاف اگسا رہے ہیں اور ڈاکھی رہے ہیں۔
اس خط سے نہ ٹھہریں مہاراج اٹ۔ پنڈت نے کہا۔

اس خط میں جو کچھ لکھا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ مہاراج قنوج نے کہا تم نے محمود کو چھوٹا اطلاع بھجوا دی ہے کہ گنگا اور جہان کے درمیان اُس کے لیے جہاں بچھا یا جا چکا ہے اب دیکھا وہ اپنی فوج کو یہاں کس ترتیب سے لائے گا۔ وہ کوچ کی ترتیب میں نہیں آئے گا۔ اُس کی فوج کے بازو پھیلے ہوئے ہوں گے۔ اُس کی پوری فوج آگے نہیں آئے گی۔ آپ نہیں جانتے پنڈت جی مہاراج! سلطان محمود چیلے جس کی موجودگی کا آپ کو اُس وقت پتہ چلتا ہے جب آپ کی گردن اُس کے دستوں میں آچکی ہوتی ہے اور اُس کے پنجے آپ کے جسم میں اتر چکے ہوتے ہیں کسی کو پتہ نہیں چلتا کہ اُس نے درخت پر سے چل کر کیا ہے یا گھاس میں سے۔

مہاراج کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ بتایا گیا کہ قاصد آیا ہے۔ مہاراج نے اُسے فوراً بلایا۔ قاصد نے اطلاع دی کہ سلطان محمود قنوج کو محاصرے میں لے رہا ہے۔ کیا ایسا امکان ہے کہ ہم پچیسے سے محاصرے پر حملہ کریں تو سلازوں کو نقصان پہنچا سکتے ہیں؟ مہاراج نے پوچھا۔

”نہیں“ قاصد نے کہا۔ مسلمانوں کی فوج کا ایک حصہ قنوج کو محاصرے میں لے رہا ہے اور اُس کے بہت سے گھوڑے سوار دے دیتے قنوج اور قنوج کے درمیانی علاقے میں اس حالت میں خیر ذن ہو گئے ہیں کہ انہوں نے خیمے نہیں گاڑے وہ پٹوئیکے ہوئے ہیں لیکن تیزی کی حالت میں ہیں۔ ہر سارا رات کو اپنے گھوڑے کو اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ ہمارے آدمیوں نے جنگی لوگوں کے ہمیں میں دیکھا ہے کہ سلطان قنوج کے آدمی دُور دُور تک گشت کرتے رہتے ہیں۔ ہم نے انہیں دیکھے اور انہیں چٹا لال پر بھی غزنی کے فوجی دیکھے ہیں۔

”تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اگر اپنی فوج قنوج کی مدد کے لیے بھیجیں تو غزنی والے

سے راستے میں ہی ہلکے گئے۔ مہاراج قنوج نے کہا۔
”بھئی بتایا گیا ہے کہ میں آپ سے کہہ دوں کہ قنوج کی طرف اپنی فوج کو بھیجنے کی کوشش نہ کریں۔“ قاصد نے کہا۔

”میں نے آپ نے پنڈت جی مہاراج! — مہاراج نے کہا اور اپنی فوج کے کمانڈروں کو بلایا۔ وہ آئے تو مہاراج نے انہیں صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ اگر آپ قنوج کو بچانا چاہتے ہیں تو دیکھیں کہ قنوج کے راجپوت لڑتے ہیں یا ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ اگر وہ محاصرے میں جم جائیں اور باہر آکر لڑنے کی کوشش کریں تو آپس میں دُور۔ اگر نہیں تو قنوج کو بچانے کی کوشش کر دو۔“

نومبر ۱۸۱۸ء میں سلطان محمود غزنوی نے قنوج کے قلعے کو محاصرے میں لے لیا۔ اُسے بتایا گیا تھا کہ قنوج کے راجپوت اپنی اہل برہمن دینے والے جنگجو ہیں اور انہیں تہ تیغ کرنا آسان نہیں ہوگا۔ اُس نے جو محاصرہ کیا وہ سطر نہ تھا۔ قلعے کے پیچھے صیائے جہاں تھا۔ سلطان کو یہ بھی بتایا گیا تھا کہ محاصرے پر قنوج کی فوج حملہ کرے گی۔ چنانچہ اُس نے اپنی فوج کے بہت سے سوار رستے قنوج اور قنوج کے درمیان پھیلا دیئے تھے۔

اُس نے جب سرطانی محاصرہ مکمل کر لیا تو مہاراج بروک وہ غلط اطلاع لے کر قنوج گیا جو اُسے قنوج کے بہت سے سوار رستے قنوج اور قنوج کے درمیان پھیلا دیئے تھے۔ لایا ہے۔ سلطان نے اُس وقت سمجھا کہ ایک قاصد اس پیام کے ساتھ دُور دُور قنوج دے گا۔ مہاراج چور آیا ہے اُس کے آدھے دستے قنوج آجائیں اور تمام ہاتھی ساتھ لے گئے جائیں۔ اُس وقت تک اُس کے پاس کم بیش سارے تین سو چالیس ہاتھی تھے۔ جب یہ کنگ آگئی تو سلطان محمود نے اُسے اُن دستوں سے بھی آگے قنوج کی طرف بھیج دیا جو قنوج اور قنوج کے درمیان تیاری کی حالت میں موجود تھے۔ ہندوستان پر محمود غزنوی کے سترہ حملوں میں قنوج کے محاصرے کا ذکر نہیں ملتا۔ تفصیلات میں جائیں تو سمجھنا سہا ذکر آجاتا ہے لیکن قنوج کے محاصرے اور محاصرے میں سلطان محمود کو اس قدر زور صرف کرنا پڑا تھا جو سمجھنا جلد شہر، مہاراج کی فتوحات کو مٹا کر بھی صرف نہیں

ہوا تھا۔ منج کے راجپوتوں کا یہ عالم تھا کہ فوجی اور شہری میں کئی فرق نہیں رہا تھا۔
نوعمرز کے بھی اپنے شہر کو پکانے کے لیے نکل آئے تھے۔

مشہور مورخ غلطی نے منج کے راجپوتوں کے متعلق لکھا ہے۔ وہ بے مہار اور
خود سراندیش کی طرح اسرار نہ ماننے والے شیطانوں کی طرح لڑے۔

سلطان محمود میاں صوفی کی کمان خود کر رہا تھا۔ وہ جدھر سے اپنے حبش دروازے
تورنے کے لیے یا دیوار میں کہیں ٹرنگ لگانے کے لیے آگے بھٹتا تھا، ان پر ترروں اور
برھیوں کی دھجھکیں آنے لگتی تھیں۔ غزنی کے پیرانداؤں نے آگے بڑھ کر قلعے کی
دیواروں سے تیراہ برھیاں برسانے والوں پر اتنی ہی تعداد اور شدت سے تیر چلائے
لیکن راجپوت تیر کا کرنگی ہوتے اور گرتے تھے اور ان کی جگہ فوراً دوسرے آدمیوں
سے پُر ہو جاتی تھی۔ قلعے کی دیواروں سے یہ ٹکار بار بار سنائی دیتی تھی۔ ”محمود! دایس
پلے جاؤ۔ بسلا اہم اپنے ترستان میں آئے ہو۔ اور اس لٹکار کے ساتھ گالی
گھوج بھی سنائی دے رہی تھی۔

”یہ قلعہ آسانی سے نہیں ٹوٹے گا۔“ سلطان محمود نے کہتے ہوئے کئی اہل بندوبست
کرنا پڑے گا۔

میاں صوفی کا پہلا دن گز گیا اور سلطان محمود کی فوج کو خاما جانی اٹھانا پڑا۔
قلعے کے اندر کا یہ عالم تھا کہ عورتیں اور بچے بھی تیر کمانوں، برھیوں اور تلواروں سے
مسلح تھے۔ شہری رائے چند کے محل کے سامنے جمع ہو گئے تھے۔ وہ نعرے لگا رہے
تھے کہ انہیں باہر جا کر مسلمان فوج پر حملے کی اجازت دی جائے۔ رائے چند ایسا اٹاڑی
نہیں تھا۔ وہ شہر لوں کو نہ قلعے کی دیواروں پر جانے دے رہا تھا نہ انہیں باہر نکلنے کی
اجازت دے رہا تھا۔

”لڑائی اس جوش سے شیں لڑی جاتی جس میں عقل نہ ہو۔ رائے چند نے اپنے ہزار
شہروں سے کہا۔ ”منج کو آخر تم ہی بچاؤ گے۔ ہم نہیں چلنے کو غزنی کی فوج جو دیواروں اور
ڈکوں کا گردہ نہیں۔ یہ ایسی فوج ہے جس کے آگے قلعے کا پناہ کر گرتے جاتے
ہیں۔ تمہاری فوج قلعے کو بچا رہی ہے۔ اگر دشمن اندر آ گیا تو منج کی آبرورہا سے ہاتھ میں

ہوگی۔ ہم منج اپنے دشمن کو اس طرح نہیں دیں گے جس طرح ان بزدلوں نے مسکرا
اے دے یا اللہ ہری کشن واسدیو کا بتیا چار کرایا ہے۔

”جو گرجنے لگا۔ ہم انتقام لیں گے۔۔۔ ہمیں باہر جانے دو۔“

”رائے چند نے قوم میں سے بہت سے جوان آدمی الگ کر لیے اور یہ بتا کر کہ انہیں
جان کی بھاری لگائی ہے، اپنے ساتھ رکھ لیا۔

”رائے چند کے محل کی عورتیں بھی مسلح ہو گئی تھیں اور وہ شہر کی عورتوں کو لڑنے مرنے
کے لیے نکل کر رہی تھیں۔ صرف ایک عورت تھی جو خاک و خون کے اس ہنگامے سے
لا تعلق تھی۔ وہ رائے چند کی بیٹی رادھا تھی۔ پہلے سنا یا جا چکا ہے کہ رادھا اور رائے چند
کی بہن شیلما ہمارا جہ منوج کے بیٹے کھمیں پال کے ساتھ سلطان محمود کو مسکرا میں قتل کرنے
کے لیے گئی تھیں۔ یہ دونوں لڑکیاں اپنے عزیز سہولی جن جوانی کو ہتھیار کے طور پر استعمال
کرنے لگی تھیں۔ وہ ایک خیالی جنگی قبیلے کے لباس میں تھیں جس میں وہ نیم غریب تھیں۔

اس طرح ان کے جن کی دلکشی اور زیادہ طلسماتی اور خطرناک ہو گئی تھی مگر اسے میں
ایک گرجھ نے شیلما کو مل لیا۔ رادھا نے شیلما کو گرجھ کے منہ میں اس طرح دیکھا کہ شیلما کا
ایک بازو چہرے کا کچھ حصہ اور لہجہ کے بدلنے جیسے بال نظر آ رہے تھے۔

پھروں جو کہ مسکرا میں منجم غزنی کی فوج کا ایک نائب سالار دوکاندلوں کے
ساتھ اس علاقے میں گشت پر نکلا۔ اُس نے کھمیں پال اور رادھا کو پہچان لیا اور دونوں
کو مسکرا لے گیا۔ رادھا جیسی نوجوان، دلکش اور نرم عورتوں کی کیسے توقع رکھ سکتی تھی کہ نائب
سالار اور دوکاندار اُسے جی کا درجہ دیں گے۔ پھر وہ مسکرا تک اس تلخ مسکرا میں پہنچی تھی
کہ دہلی وہ نہ جانے کیسے وحشی آدمیوں کے ہاتھوں میں کھلو نہ بنے گی اور نہ چلنے اس
کا انجام کیسا بھیانک ہوگا۔ اُسے غزنی کے مسلمانوں کے متعلق کچھ سنی سے یہ کچھ بتایا جاتا
رہا تھا کہ مسلمان عورت کے لیے وحشی اور مردوں کے لیے آدم خود ہوتے ہیں۔

رادھا نے کبھی مسلمان نہیں دیکھا تھا۔ بس سنے میں ایک بھی مسلمان نہیں تھا۔ رائے
جب چڑھا کہ سلطان محمود مسلسل کے بٹ توڑ کر کھینک رہا اور سندھا جاڑ دیتا ہے تو
رادھا کو یقین آ گیا تھا کہ مسلمان واقعی جنگوں اور غلامی میں رہنے والی کوئی قوم ہے۔

جس کے ہاں مذہب کا وجود ہی نہیں وہ صرف ہندومت کو مذہب سمجھتی تھی اور وہ غیرت اور اکہ کو اپنی جان سے زیادہ قیمتی جانتی تھی لیکن اپنے دشمن کو زیر کرنے کے لیے وہ اپنی اکہ کو ایک جائز ذریعہ سمجھتی تھی اگر وہ جب سلاٹوں کے اکھاڑائی کو کسی نے اسے اتنا بھی نہ کہا کہ تم بہت خوبصورت لڑکی ہو۔ نائب سالار اور کرنل دونوں نے ستر لک کے ایک دن اور اسی رات ہم کے سفر میں اسے ایک قیدی سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں دی۔ اس کے سامنے، قنوج کے راجہ گھنٹاں وال نے نائب سالار کو سونے کے وہ تمام کچے پیش کیے تھے جو اس کے پاس تھے لیکن نائب سالار نے ان کی طرف دیکھا تک نہیں تھا۔

اد جب راوہا اور راجہ کو سلطان محمود کے سامنے لے گئے تھے تو سلطان کا چہرہ دیکھ کر راوہا کے دل میں نفرت کا طوفان اٹھ اٹھا اسے کسی اور سلوک کی توقع تھی لیکن سلطان نے اسے کہا تھا۔ ہم اس لڑکی صبی بیٹھیل کی دل سے قدر کرتے ہیں ہم غیرت مند دشمن کی عزت کیا کرتے ہیں۔ اور راوہا کو سلطان کے یہ الفاظ آج جب اس نے ستر لک کے قلعے کو مامرے میں لے لیا تھا، بہت یاد آ رہے تھے۔ مجھے قتل کرنے کی آپس ضرور کوشش کرنی چاہیے تھی۔ کامیابی اور ناکامی تہہ پہلے بیٹا کرشن واسدو اور ہر ہر مادیو کے اختیار میں نہیں، ہمارے خدا کے اختیار میں ہے۔ یہ ہے خدا کا وہ بیخام جو میں ہندوستان میں لایا ہوں۔

اس کے بعد سلطان محمود نے حکم دیا تھا۔ ان دونوں (راوہا اور گھنٹاں) کو ان کے شہروں کے قریب چھوڑ دو۔ انہیں عزت سے لے جاؤ۔ ان کے گھوڑے اور ان کے بچے انہیں دے دو۔

سلطان کے حکم کی تعمیل کی گئی اور ان دونوں کو شاہی جہانوں کی طرح ان کے شہروں کے مصنافات میں چھوڑ آئے تھے۔

راوہا نے اپنے باپ رائے چند کو کسی اور جذبے سے بتایا تھا کہ وہ سلطان محمود غزنوی کو قتل نہیں کر سکی اور کپڑی گئی تھی اور سلاٹوں نے اور ان کے سلطان نے اسے جی کا درجہ دے کر عزت سے واپس کر دیا ہے۔ اس نے باپ کو وہ تمام باتیں

بتائی تھیں جو سلطان محمود نے اسے اور گھنٹاں وال سے کہی تھیں مگر اس کا باپ اس کے ہاتھ کو نہیں کھسکا تھا۔ اس نے کہا تھا۔ ہم اپنی بے عزتی کا انتقام لیں گے۔ راوہا راجہ کی تھی، معمولی لڑکی نہیں تھی مگر وہ ایسے محسوس کرنے لگی جیسے آسمان سے گر کر زمین پر آ پڑی ہو۔ وہ بہت شوخ اور بڑی ہی دلیر لڑکی تھی مگر اس پر غصہ طاری ہو گئی اور وہ کھولی کھولی رہنے لگی۔ راج محل میں راج دربار میں اور فوجی حلقوں میں اب شیخ کے دفاع اور سلطان محمود کو شکست دینے کی تیاریاں ہونے لگی تھیں۔ غزنوی کی فوج کسی بھی روز متوقع تھی۔ رائے چند لڑائی کے سوا اور کوئی بات ہی نہیں کرتا تھا۔ مسندوں میں بھی مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلائی جا رہی تھی اور لوگوں کو بڑی خورج جنگ کے لیے تیار کیا جا رہا تھا۔ عہدوں میں جوش و خروش پیدا ہو گیا تھا۔ رائے چند کی داستانوں نے بھی لڑنے کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ صرف راوہا تھی جو ان سرگرمیوں سے الگ تھلگ چپ چاپ لٹی رہتی یا تلے کی دیوار پر جا کر مٹھرا کی طرف دیکھنے لگتی تھی۔

ایک روز وہ دیوار پر کھڑی اتنی پر نظر میں گاڑے ہوئے تھی کہ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ وہ ادھر سے آئیں گے۔ معلوم نہیں کب آئیں گے؟

”کون آئیں گے؟“ اس کے قریب سے کسی نے پوچھا۔ ”مسلمان“ اس نے کہا۔ ”غزنوی دالے۔ اور وہ چونک کر چپ ہو گئی۔ اس نے دیکھا۔ اس کے پاس ایک رشی کھڑا تھا۔ وہ تو اپنے آپ کو تنہا سمجھ رہی تھی۔ رشی کے روتے اور دھبے سے واقف تھی۔ وہ بڑے مندر کے پنڈت کے درجے کا آدمی تھا۔ اپنے مذہب کا عالم ہونے کے علاوہ علیل رجوں کا علاج اپنے گھنٹی خاص عمل سے کرتا تھا۔ آسیب اور بد رجوں سے نجات دلاتا تھا پنڈت بھی اسے ٹھیک کر اور ہاتھ جوڑ کر سلام کرتے تھے مگر اسے اپنے پاس کھڑے دیکھ کر راوہا کو غصہ آ گیا۔

”کیا راجہ کی مسلمانوں کا انتظار کر رہی ہے؟“ رشی نے پوچھا۔ ”میری تنہائی میں آپ نے کیوں داخل دیا ہے؟“ راوہا نے غصے کو دبا کر

ہوئے پوچھا۔

”اس لیے کہ ہماری راجکاری کی مدد پر اب آسیب سوار ہو گیا ہے جو ہمارے سوا کوئی نہیں نکال سکتا۔“ رشی نے کہا۔ ”مجھے ہمداج (رائے چند) نے کہا ہے کہ جب سے آپ مہترائے آئی ہیں، آپ کی حالت بگڑ رہی ہے۔ میں جانتا ہوں راجکاری مسلمان بھڑیئے ہیں۔ مانس کھانے کو یہاں آجاتے ہیں۔ آپ کتنا ہی برہم کیوں نہ ڈالیں، میں جانتا ہوں کہ انہوں نے آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ وہ سونے، ہیروں اور عورتوں کے بھوکے ہیں۔ انہی کی تلاش میں آتے ہیں۔“

”یہ جھوٹ ہے۔“ دادھانے بھڑک کر کہا۔ ”انہوں نے میرے ساتھ نہ لوک نہیں کیا جو آپ بتا رہے ہیں۔ وہ عورتوں کے شکاری نہیں۔ میں نے غزنی کے سلطان کے دربار میں ایک بھلی عورت نہیں دیکھی۔ عورتیں میرے باپ جیسے ہمارے جوں کے دبدوں میں جوتی ہیں۔ ان کے پیچھے جوان اور خوبصورت لڑکیاں کھڑی ہو جھیل پلائی رہتی ہیں۔ ان کی خدمت کار جوان لڑکیاں جوتی ہیں۔ انہیں لڑکیاں سلطانی اور لڑکیاں جنگلی ہیں۔ یہاں بھڑیئے نہیں، انسان ہیں۔ انہوں نے ہمارا دیا ہوا سونا بھی چھڑا دیا تھا۔“

رشی دانشمند آدمی تھا۔ اُس نے دادھاکو روکنے کو کہنے کی بجائے اُس کے ساتھ پیاسے ایسی باتیں کیں کہ اُس کا غصہ ٹھنڈا کر دیا اور اُس کے دل پر قبضہ کر لیا۔ اُس کی باتوں کا اثر تھا کہ وہ رشی کے ساتھ چل پڑی۔

رشی ہر روز دادھاکے پاس جانے لگا۔ بہت دیر اُس کے پاس بیٹھا اس کے ساتھ باتیں کرتا رہتا۔ اُس نے محسوس کر لیا کہ دادھا پر واقعی مسلمانوں کا آسیب سوار ہو گیا ہے اور اُس کے ساتھ ایک دہشت ہے جو اُس کے ذہن کو گرفت میں لیے ہوئے ہے۔ دادھانے رشی کو یہ دہشت تفصیل سے بتائی۔ وہ ہر رات خواب میں ایک گرہچہ دیکھتی تھی جس کے منہ میں سیلا ہوتی تھی اور گرہچہ کے منہ سے خون ٹپک رہا ہوتا تھا۔ دادھا نہ کہ جاک اٹھی تھی اور اس کا جسم سردی کے باوجود پیسے میں نہا

جاتا تھا۔

رشی اُس کی یہ دہشت باتوں سے ہی مدد کر سکتا تھا۔ وہ اس کوشش میں مصروف رہا مگر دادھاک کی جسمانی حالت مدد پر فربہ ہوئی جلد ہی تھی۔ اس کا باپ لائے چندا جنگ کی تیدی کی وجہ سے ذاتی طور پر اس کی طرف توجہ نہیں دے سکتا تھا۔ اُس نے راجکاری کے علاج کا حکم دے دیا تھا۔ رشی کے علاوہ نامی گرامی یدائس کا علاج کر رہے تھے مگر اُس کی حالت بگڑتی جلد ہی تھی۔ اُس نے وہاں کھانے سے انکار کر دیا اور رشی کو اُس نے ہمارا بنالیا۔

”رشی جی! ایک مدد دادھانے اُسے کہا۔ مسلمانوں کے سلطان نے مجھے کہا تھا کہ لایا بی ادھار ناکامی تمہارے دیوتا کرشن واسیو ادھار ہر ہر مادیلوک کے اختیار میں نہیں، ہمارے خدا کے اختیار میں ہے۔ میں نے اُس کا ہر ایک لفظ سمجھا ہے کیا وہ گرہچہ مسلمانوں کا خلیفہ جس نے راستے میں اگر شیلہ کو کھالیا تھا اور ہمدے بنادی مہم نہیں کس کے تیروں سے مر گئے اور ہر پڑے گئے؟ میں نے ہر ی کشن کی جنم بھومی کو ابھرا ہوا دیکھا ہے۔ بُت ٹوٹے ہوئے دیکھے ہیں۔ یہی ہیں ناہمدے دیوتا اور ہمارے بھگوان؟ اگر ان میں کوئی طاقت جوتی تو مسلمان فنا ہو چکے ہوتے۔“ رشی نے اُسے ہندو مت کی کرامات کا قائل کرنے کے لیے بہت کچھ کہا اور اپنے مذہب کی وہ مدائیں سنائیں جنہیں انسانی عقل تسلیم نہیں کر سکتی۔ ان کے مقابلے میں اُس نے مسلمانوں کو چھوٹا اور ذلیل کہا اور اسلام کو بے بنیاد مذہب قرار دینے کی پوری کوشش کر ڈالی۔

مگر میں نے جو دیکھا ہے اسے میں کس طرح جھٹلا سکتی ہوں؟ دادھانے کہا۔ ”کچھن پال میرے ساتھ تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ اُسے مسلمانوں کی فوج کا بڑا مہم ہو گیا ہے اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ اُس نے ان میں عورت اور شراب نہیں دیکھی۔ ہم وہاں سے صبح کے وقت چلے تھے۔ مجھے اور کچھن کو انہوں نے بہت سویرے جگادیا تھا۔ باہر ابھی دھند لگا کھڑا تھا کبھی انسان کی بڑی ہی سُربلی آواز ابھری جس کا اثر میرے دل پر ہونے لگا۔ میں نے اپنے پہرہ دار سے بچھا کر یہ کوئی غالی کی زبان

میں گارہا ہے، اُس نے بتایا کہ یہ اذان ہے۔ یہ ہمارے خدا کے الفاظ ہیں میں ایک بھی لفظ نہ سمجھ سکی مگر اس آواز نے مجھ پر جادو کا سا اثر کیا کچھ دیر بعد میں نے دیکھا کہ مہر میں مسلمانوں کی جتنی فوج تھی ایک میدان میں صفوں میں کھڑی ہو گئی۔ ایک آدمی ان کے آگے کھڑا ہو گیا اور وہ کہیں جھکے کہیں ماتھے زمین سے لگا لیتے یہ پرہ دار بنے مجھے بتایا کہ یہ ان کی عبادت ہے۔ ریشی جی! عبادت کا یہ طریقہ تجھے بہت اچھا لگا۔ میں نے پرہ دار سے پوچھا کہ یہ کس کی عبادت کر رہے ہیں؟ ان کے سامنے کوئی بت نہیں، کوئی نمونہ نہیں.... پرہ دار نے کہا کہ ہم جس کی عبادت کرتے ہیں وہ ہماری دلوں میں ہے اور وہ ہر جگہ موجود ہے وہ خدا ہے۔ اُس نے ہمیں فتح دی ہے ہم جب اُس کی عبادت سے مستحضر ہوں گے اور اُس کے احکام نہیں مانیں گے تو ہم ہر میدان میں شکست کھائیں گے۔

ریشی سُن سُن کر بے چین ہوتا جا رہا تھا اور راہا بولے جارہی تھی۔ میں نے پرہ دار سے پوچھا کہ تمہارا سلطان تو عبادت نہیں کرتا ہو گا۔ وہ تو سلطان ہے۔ پرہ دار نے کہا کہ سلطان عبادت میں موجود ہے۔ وہ پاسیوں میں کہیں بیٹھ جاتا ہو گا۔ وہ پاسیوں کی طرح خدا کے آگے جھکتا اور سجدہ کرتا ہے۔ عبادت کے وقت وہ سلطان نہیں ہوتا.... ریشی جی! ہمارے پتاجی مبارک کبھی مندر میں جاتے ہیں تو مندر سے سب کو نکال دیتا ہے.... سچا کون ہے ریشی جی! کیا ہمارا خدا نہیں ہوتا؟ ریشی نے بتانا شروع کیا کہ ہندومت میں خدا کا تصور کیا ہے لیکن راہا جانے اسے رک دیا اور بولی۔ کیا کچھ خراب ہے؟.... نہیں۔ مگر مجھے تجھے ہر رات تھکاتے ہیں کہ دل میں خدا اُتر آیا ہے۔

”مہاراج!۔۔۔ ریشی نے رائے چننا سے کہا۔“ راجکارمی یا گل ہو چکی ہے۔ معلوم ہوتا ہے مہتمم میں مسلمانوں نے اسے کوئی ایسی چیز یاد دی ہے جس کا اثر ابھی تک نہیں اُترا۔ برہماری میرے علم اور میرے عمل سے باہر ہے۔ وہ اپنے مذہب سے منحرف ہو چکی ہے۔ اب تو یہ کچھ کچھ کھلتی ہی رہتی ہے بعض اوقات بولتے بولتے چپ ہو جاتی

ہے اور بڑی زور سے چیخ مار کر اپنے بھروسے کو ہاتھوں سے پکڑے سے ڈھانپ لیتی ہے۔ اکثر یہی رٹ لگائے رکھتی ہے۔ ”میرے دل میں خدا اُتر آیا ہے۔“ یہ مسلمانوں کا اثر ہے۔

”میں اس حال میں رہنے دوں۔۔۔ رائے چننا نے کہا۔“ میں سلطان محمود کا سر کاٹ کر اس کے سامنے رکھوں گا تو اس کے دل سے مسلمانوں کا خدا نکل جائے گا۔ مجھے ابھی کوئی فرصت نہیں ریشی جی! غزنی کی فوج بہت قریب آگئی ہے۔“ اگلے ہی روز غزنی کی فوج نے منج کو محاصرے میں لینا شروع کر دیا اور پھر راجپوت راہا کی کسی کوشش اور نگرہی نہ رہی مگر راہا کے کان میں جب یہ خبر پڑی کہ اس کا قلعہ محاصرے میں آگیا ہے تو اس نے اٹھ کر باند بھیلادیے اور بلند آواز سے بولی۔ ”دو آگے ہیں۔ سلطان آگیا ہے۔ دو آواز سے کھول۔۔۔ میری عزت اور عزت کے کھولنے آگئے ہیں۔“

اس وقت ایک دیدار و خدمت گار عورتیں وہاں موجود تھیں۔ سب نے کانوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ راہا باہر کو دوڑی تو اسے پکڑ لیا گیا۔ رائے چننا وہاں موجود نہیں تھا۔ اُس کی ماں کو بلایا گیا۔ وہ بھی محاصرے کی وجہ سے گھبرائی ہوئی تھی۔ اُس نے اپنی بیٹی کی یہ حالت دیکھی تو دیدے کہ اگر اسے کوئی ایسی دوائی دے دو جو اسے بے ہوش کر دے، پھر جوں ہی ہوش میں آئے اسے بھرے ہوش کر دیا جائے۔ راہا کو پکڑ لیا گیا اور دیدے نے اُس کے منہ میں دوائی ڈال دی۔ بھٹوڑی دیر بعد راہا کا جسم بے حس ہو گیا۔ کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا۔

محاصرے کا پہلا دن گزر گیا۔ سلطان محمود نے رات کو بھی آرام نہ کیا۔ وہ قلعے کے پچھلے چلا گیا۔ جدھر دیا تھا۔ پانی قلعے کی دیوار کے ساتھ لگ کر بہتا تھا۔ سلطان نے اپنے سالاروں سے کہا کہ ہر سیاہ دستے سے دو دو چار چار جہاز قسم کے سپاہی ملے۔ کریں اور ان کا ایک الگ ٹیم بنا کر اسے محفوظ (رہزہ) میں بھیج دیا جائے۔

دوسرے دن غزنی کی فوج نے ایک بار پھر قلعے کے بڑے دروازے پر چڑھ کر گرا پرستے راجپوتوں نے تیرا در بر چھیاں جیت کر غزنی دلوں کو بہت نشانہ بنایا مگر

سلطان محمود نے پچاس جانباز لاکھ کر لیے۔ لڑائی کا زور تقسیم کیا تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے فضا تیروں سے خالی ہو گئی تھی۔ تلے کی دیواروں پر اندھ بڑھوں میں کچھ کرکری تھیں۔ سلطان محمود تلے سے تقریباً تین میل دُور تھا۔ اُس نے جانبازوں کو خودِ حافظ کسا

دانا بن گیا جس میں سے ایک آدمی کھڑا ہو کر گزر سکتا تھا۔ دریا کا پانی تلے کے اندر جانے لگا۔

تلے میں کسی نے پانی دیکھ لیا اور اس نے شور مچا دیا۔ جانباز اپنا کام کر چکے تھے۔ وہ دیکھے کو چل بڑے مگر راجپوت بھی جانباز تھے۔ وہ مشعل اٹھائے دوڑے آئے۔ بہت سے برہمنوں اور تلواروں کے ساتھ آئے غزنی کے جانباز تیر کی سے باہر نکل آئے۔ راجپوت ان کے پیچھے آئے۔ دریا میں خوریز مگر لڑا گیا۔ اندھے کی مشعلیں سرنگ کے راستے باہر آگئی تھیں۔ ان کی روشنی میں دوست اور دشمن کا پتہ چل رہا تھا۔ سلطان محمود کی نظر انہی جانبازوں پر پڑی۔ اس نے ان کی خبر لینے کے لیے دو تین آدمی اس کے بھیج دیے تھے۔ ان آدمیوں نے اس کو اطلاع دی کہ دریا میں لڑائی ہو رہی ہے۔ سلطان نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ دریا میں جتنا مشعل نظر آ رہی تھیں جیسے دریا میں تیر رہی ہوں۔ اس نے کم دیش تین سو سپاہیوں کو سپاہ میں آکر دیا اور مشعل بردار بھی ساتھ بھیج دیئے۔ ”معلوم ہوتا ہے میرے جانبازوں نے دیوار میں نقب لگالی ہے۔“ سلطان مجھنے اپنے سالار سے کہا۔ ”اندھے اسی راستے دشمن باہر آیا ہوگا۔ جاؤ دیکھو اور مجھے بتاؤ۔“

دریا کا پانی تلے کے اندر جا رہا تھا اور سرنگ میں سے راجپوت باہر آ رہے تھے۔ لاشیں اور زخمی دریا میں بہتے جلد سے تھے مشعلوں کے شعلے دریا پر ناز رہے تھے۔ سلطان محمود نے بہت سوچا کہ وہ اس سرنگ سے اپنا ایک دست تلے میں داخل کر سکتا ہے یا نہیں۔ اسے سرنگ کھودنے والے ایک زخمی نے جو دریا سے نکل آیا تھا، بتایا کہ سرنگ سے اندر جانے کی کوشش نہ کی جائے ورنہ بہت نقصان ہوگا۔ سلطان نے حکم دے دیا کہ دریا سے اپنے آدمی واپس بلا لیے جائیں۔

دقائق نگاہوں نے محاصرے کا جو مدد برز کا آنکھوں دیکھا حال کھا ہے، نہ بہت طویل ہے۔ مختصر کہ غزنی کے مجاہدین نے خون کی بے دریغ قربانی دے کر دیواروں میں دو جگہ نقب لگا لیا مگر منہج کے راجپوتوں نے بہادری کے ایسے مظاہرے کیے کہ سلطان محمود غزنوی عیش و عشرت کر رہا تھا۔ بجائے اس کے کہ غزنی کے دستے لٹی ہوئی دیواروں سے

اندر جلتے اندھ سے راجپوت باہر آتے اند غزنی کی فوج پر حملے کرتے تھے۔ ان میں سے جزدنہ رہتے وہ پھر اندر چلے جاتے تھے۔ انہوں نے یہاں تک کیا کہ دروازہ کھول کر نکلے ہوئے سیلاب کی طرح آئے اور اس انداز سے لڑے کہ پھر واپس چلے جائیں۔

”یہ لوگ جتنے بہادر ہیں اتنی ہی احمق ہیں۔“ سلطان محمود نے اپنے سالاروں سے کہا۔ ”انہیں موقع دکر اسی طرح بے ہوش کر لیں۔ یہ اپنی طاقت تیری سے ضائع کر رہے ہیں۔“

اس دوران رادھا کو مسلسل بے ہوشی میں رکھا گیا۔ وہ ہوش میں آتی تھی تو خوف آواز میں کہتی تھی۔ ”خدا میرے دل میں اُتر آیا ہے۔“ اسے دیدے ہوشی کی دہائی پلا دیتا تھا۔

موزوں کے مطابق محاصرے کے پچیسویں روز سلطان محمود نے حکم دیا کہ تلے کی دیواروں کے شگافوں پر شدید بندوقوں کا تھک کر اندھ جانے کی کوشش کی جائے اور جو بھی راجپوت باہر آئے کسے بے کوئی مدد نہ کھولیں، حملہ کر کے دروازے کو کھلا رہنے دیا جائے۔

پچیسویں روز کی لڑائی فیصلہ کن تھی۔ راجپوت اپنی طاقت کم کر چکے تھے۔ جب غزنی کی فوج نے شگافوں پر اور ایک دروازے پر بندوقوں اور راجپوت گھبرا گئے۔ سلطان تلے میں داخل ہو گئے مگر غزنی کی فوج میں۔ راجپوتوں نے لڑنے کی بجائے مرنے کو ترجیح دی۔ ان میں سے بعض نے اپنے کنبوں (عورتوں اور بچوں) کو اپنے گھر میں بند کر کے گھروں کو آگ لگا دی اور بال بچوں سمیت زندہ جل گئے۔ جس راجپوت کو کہیں کوئی بندہ عورت نظر آئی اسے قتل کر دیا۔ منہج کے کئی سپاہیوں نے تلے کی اتنی اپنی دیواروں کے اوپر سے چھلانگیں لگا دیں اور سرنگ گئے۔

جب سلطان محمود تلے میں داخل ہوا اس وقت منہج جل رہا تھا اور اس آگ میں راجپوت جل رہے تھے۔ یہ اجتماعی خودکشی تھی صرف عمل محفوظ تھا۔ دلیں گئے تو جگہ جگہ عورتوں اور بچوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ انہیں راجپوتوں نے خود قتل کیا تھا۔ دانشاؤں اور ناپسے گانے والیوں کے سینوں میں بھی خنجر اندھا لڑی ہوئی تھیں۔ مرد بھی مرے پڑے تھے۔ راتے چند اور رانی کی لاشیں خواب گاہ میں بنگلوں پر پڑی تھیں۔

سلطان محمود نے سب سے پہلے ایک سوار دستے کو اندر بھیجا۔ اس کے پیچھے دو آدمے
دستے گئے اور جب دیکھا کہ اندر اسن دامن ہے تو وہ خود اندر گیا۔ قنوج کے کمانڈر
سے لے کر چلا کہ ہمارا راجہ راجا پال اپنے خاندان سمیت محاصرے سے پہلے ہی کہیں بھاگ گیا
تھا۔ سلطان محمود نے ہندو کمانڈروں سے پوچھا کہ فرار کہاں ہے۔ تلاش کے باوجود وہاں
کچھ بھی نہ ملا۔ سلطان نے محل کو زمین سے ملا دیا اور مندروں میں جا کر تمام رات توڑ کر باہر
پھینک دینے کا حکم دے دیا۔

صاحب بروک نے بڑے مندر کے بنڈت کو پکڑ دیا۔ بنڈت سے فرار کے متعلق
پوچھا گیا۔ اُس نے کہا: ”آپ کے اس آدمی کو معلوم ہے فرار کہاں ہے مگر اب وہاں
کچھ نہیں ہوگا۔ ہمارا راجہ سب کچھ سمجھنے لگتا ہے۔“
تھوڑا سا مڑتے لکھتا ہے۔ سلطان محمود کی یہ فتح معمولی نہیں تھی کہ ہندوستان کے
وسط میں افغانوں کو رخ اٹھیں۔

قزنی کے آدمی محل کے ہر کمرے میں گئے۔ صرف ایک کمرہ باہر سے بند تھا۔
کھول کر اندر گئے تو لنگ پیر رادھا پڑی تھی۔ اُسے بھی مڑتے سمجھا گیا مگر اُس نے آنکھیں
کھولیں اور اندر گھستی آواز میں بولی: ”خدا میرے دل میں آتا رہا ہے۔“ قریب جا کر دیکھا تو
پتہ چلا کہ مہر جی نہیں بیمار ہے۔ اُس نے مری ہوئی آواز میں پوچھا کہ تم مسلمان یا ہی
ہو؟ بہت بڑا سلطان کہاں ہے؟ اُسے ملاؤ میں اُسے بتانا چاہتی ہوں کہ میں اُس
کے خدا کا نام لے کر مر رہی ہوں۔ میں اُس کے ساتھ جوم کر رہی ہوں۔“

سب اُسے حیرت سے دیکھنے لگے۔ ایک لڑکی کے لیے سلطان محمود کو نہیں بلایا
جاسکتا تھا۔ لڑکھانے مایوسی سے سب کو دیکھا اور اُس کا سر ڈھلک گیا۔ وہ بڑی تھی۔

مُنج کے بعد سلطان محمود کو قنوج کی طرف پیش قدمی کرنی تھی مگر اُسے ایسی اطلاعیں
مل رہی تھیں جو دھوکہ معلوم ہوتی تھیں۔ صاحب بروک نے اُسے بتایا تھا کہ اُس کا اصل
مقابلہ قنوج کے گرد فوج میں ہو گا مگر بعد کی اطلاعیں یہ تھیں کہ قنوج تک کے علاقے
میں کسی فوج کا نام و نشان نہیں۔ مُنج میں سلطان بہت نقصان اٹھا چکا تھا۔ وہ
فوری طور پر پیش قدمی کے قابل نہیں تھا۔ ایک روز اُسے سالاروں نے مشورہ دیا کہ پیش قدمی کا
حکم دے دیا جائے کہیں ایسا نہ ہو کہ کھیم پال نڈرا اپنی فوج لے کر آجائے۔
سلطان محمود نے پیش قدمی کا حکم دے دیا۔ اُس نے فوج کو یوں تقسیم کیا کہ ایک
حصہ دیبا سے جہان کے کندھے اور دوسرا دیبا سے لنگا کے کنارے جلد ہوا تھا۔ ہر دوں بڑے
مضبوط تھا۔ اُس کے پیچھے سلطان محمود تھا اور یہی فوج کا بڑا حصہ تھا۔ ایک حصہ بہت پیچھے
آ رہا تھا جس کی حیثیت محفوظ کی تھی۔ ترتیب قنوج کی نہیں جنگ کی تھی۔

سلطان محمود ۲۰ دسمبر ۱۸۰۸ء (۱۸ شوال ۱۲۰۹ھ) قنوج پہنچا۔ اُس نے قلعے کا محاصرہ کر
لیا مگر مزاحمت بڑی کمزور تھی۔ سلطان اسے دھوکہ سمجھا۔ اُس نے اپنے عقب کی حفاظت
کا بندوبست کر لیا اور اُس نے دیکھ بھال کے لیے دو دروازے تک سوار بھیج دیئے۔ اُسے
برسرِ موقع تھی کہ عقب سے جلد ہو گا مگر محاصرے کے دوسرے ہی دن قنوج والوں نے
قلعہ پر سفید جھنڈا لہرایا۔

کر یہ مال تہارا ہے، یہ تہارے خزانے کا مال ہے جو تم پر خرچ کیا جائے گا۔ اور اُس نے یہ بے بہا خزانہ قوم کی بیسود اور زہنی تنگی کے لیے وقف کر دیا۔ اُس نے سنگ مرمر کی ایک جامع مسجد اور اس کے ساتھ ایک یونیورسٹی کی تعمیر کا حکم دیا۔ مسجد کا نام عروس فلک رکھا گیا۔ یہ تھی جی دلہن، اس کی تعمیر کے لیے دُور دُور سے تیار کئے گئے۔ دیواروں اور چھت میں جوہل بوسنے کھدوائے گئے ان میں سونا اور چاندی بگملا کر ٹالی گئی۔ میناروں کے گلسوں پر سونا چڑھایا گیا۔ مسجد کے اندر نہایت دلکش اور قیمتی قالین بچھائے گئے۔ یونیورسٹی کو سلطان محمود نے اپنی نگرانی میں شمالی دلا معلوم بنایا۔ اس میں اس نے مختلف زبانوں کی کتابیں جمع کر دیں۔ مکمل ہو کر جامع مسجد اور یونیورسٹی علم و فن کا ایسا مرکز بن گئی جس کی مثال کم از کم عالم اسلام میں نہیں ملتی تھی۔ دُور دُور سے ملے اور اساتذہ بلائے گئے جن کے لیے اُس نے کثیر رقم وقف کر دی۔ طلباء کے لیے بھی بے انداز رقم الگ کر دی گئی جو انہیں وظیفوں کی صورت میں ملتی تھی۔

مختارم فرشتہ اور ابرونی لکھتے ہیں کہ جامع مسجد اور یونیورسٹی مسند احمد تونج کی فتح کی یادگار کے طور پر تعمیر کی گئی تھیں۔ تاریخ نویسوں نے سومات کو زیادہ اہمیت دی ہے لیکن سلطان محمود کی نگاہ میں مسند احمد زیادہ اہم تھا کیونکہ مسند احمد ہندوؤں کے برہمنوں کی کرشمہ کی جائے پیدائش ہے اور ہندوؤں کے ہاں مسند احمد ہی رجب حاصل ہے جو مسلمانوں کے ہاں کھمبہ اور مدینہ منورہ کو حاصل ہے۔

سلطان محمود جو مال غنیمت لایا تھا اس میں سونے اور چاندی کے تیس لاکھ درہم تھے۔ ہر بے جا اہرات اور سونے کے ٹکڑوں کا کوئی حساب نہ تھا۔ بچپن ہزار ہندو خیمیں اور سانسے تین سو ہاتھی تھے۔ گھوڑوں اور تلواروں کا بھی کوئی شمار نہ تھا۔ مشہور مورخ محمد تاقم فرشتہ نے لکھا ہے کہ سلطان محمود ہندوستان سے تین عجیب چیزیں لایا تھا۔ ان میں ایک اٹھتی تھا، ایک فاختہ اور ایک بھڑ۔

یہ ہاتھی اُسے مسند احمد تونج کی طرف پیش قدمی کے دوران اس طرح ملا تھا کہ جتنا کہ دایں کنارے پر اسانی نام کی ایک ریاست تھی جس کا حکمران چندر رائے تھا۔ سلطان کو اُس کے جاسوسوں نے بتایا تھا کہ چندر رائے کے پاس ایک اٹھتی اتنی

بلا ساغون کی سمن تاش

سلطان محمود غزنوی ہندوستان میں مسند احمد تونج ۱۰۱۹ (۴۱۰ ہجری) میں کوہ تہ تیغ کر کے غزنی میں داخل ہوا۔ اُس کی سلطنت میں پہلے ہی اطلاع پہنچ چکی تھی کہ سلطان کوئی ایک راجوں ہمارا جوں سے بھید دلا کر واپس آ رہا ہے۔ لوگ اپنے فاتح سلطان کے راستے میں جمع ہو گئے تھے۔ دلا کے راجہ اپنے تھے۔ فوج نمبرے لگا رہی تھی۔ عورتیں مدد کھڑی اپنی فوج کی بلاؤں سے رہی تھیں۔ لوگ جب ان بچپن ہزار ہندو قبیلوں کو اندھین سوچا پاس ہاتھوں کو دیکھتے تھے جو سلطان محمود ہندوستان سے لایا تھا تو وہ خوشی سے ناپچڑھ لگتے تھے۔ غزنی ہمارے بچہ سلطان محمود کے راستے میں آن کھڑا ہوا تھا۔ داد و تحسین اور نعروں کا شور زمین و آسمان کو ہلار رہا تھا۔

منعقب محمد بن اور بعد کے تاریخ نویسوں نے لکھا ہے کہ غزنی پہنچ کر سلطان محمود نے حکم دیا کہ وہ جو ملل و دولت ہندوستان سے لایا ہے، وہ محل کے باہر کھول کر رکھا جائے۔ جب زرد جاہرات اور دستوں کے انبار اُس کے سامنے رکھے گئے تو غرور اور کبر سے اُس کی گردن تن گئی۔

یہاں تک تو حقیقت ہے کہ اُس نے تمام تین غنیمت اپنے محل کے باہر کھول کر رکھا تھا لیکن اُس دور کے بہتروں نے جن میں الزمخشاری اور ابو عبد اللہ یاقوت خاص طور پر قابل ذکر ہیں، لکھا ہے کہ سلطان محمود نے جب اپنی سلطنت کے عوام کا اس قدر پرشوش خیر مقدم اور اُن کی بے تابیاں دیکھیں تو اُس نے کم دیا کہ وہ تمام زرد جاہرات اور خزانے ان لوگوں کے سامنے رکھ دو جو ہم ہندوستان سے لاتے ہیں اور انہیں دلو

سے ایک بھرا لایا تھا جس میں یہ غولی تھی کہ اسے پانی میں ڈبو کر اس سے پکے قطرے زخم پر ڈالنے سے زخم بہت جلدی ٹھیک ہو جاتا تھا۔

سلطان محمود نے اپنا چھوٹا سا قائد شیخ ابوالحسن خرقانی کے آستانے سے کھایا ایک میل دُور روک لیا اور وہ گھوڑے سے اُترا۔ اُس نے سمونی سے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس قدر سمونی کہ اُسے نہ جانے والوں کو شک تک نہ ہو سکتا تھا کہ وہ سلطان محمود ہے جس نے سارے ہندوستان پر لرزہ طاری کر رکھا ہے۔ اُس نے اپنے محافظوں کو دیں رُکے رہنے کو کہا اور خود میدانِ جلی پڑا۔ اپنے پیرو مرشد کے سامنے وہ شانِ شانِ شوکت سے کبھی نہیں کیا تھا۔ شیخ ابوالحسن خرقانی کے ہاں بیکار اُس نے اُن کے ہاتھ جوئے اور سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

”وہ دقت یاد کر جب تم ہندوستان سے شکست کھا کر آئے تھے شیخ خرقانی نے کہا۔ ”تم مل برہاشہ تھے۔ بتاؤ اسی فوج کٹ گئی تھی۔ بتاؤ اسی بہت ٹوٹ گئی تھی اور یہاں بتاؤ اسی دشمن ہمیں لاش بھر کر تمارے اوپر گدھوں کی طرح منڈلانے لگے تھے۔ مجھے دہشتہا کہ تم ہتھیار ڈال کر بیٹھ جاؤ گے۔ فتح اور شکست خدا کے اختیار میں ہے۔ ہمارے وہ ہیں جو شکست کو تسلیم کر لیتے ہیں اور شکست کو دی تسلیم کرتا ہے جس کا ایمان کمزور ہوتا ہے“

”تم شہیدوں کے خون کی قیمت ادا نہیں کر سکتے محمود! ان کی تدفیر کر سکتے ہو اور یہ تمہارا فرض ہے۔ یاد رکھو! تم اگر انہیں بھول گئے جو غورے لگاتے اور سینہ مٹانے تمہارے ساتھ گئے تھے عمر واپس نہیں آسکے تو اس کی سزا اس دنیا میں پاؤ گے۔ وہ تمہارے حکم سے نہیں خدا کے حکم سے لڑے تھے۔“

”میں نے اُن کی بادی میں ایک جامع مسجد اور ایک دارالعلوم کی تعمیر کا حکم دے دیا ہے۔“ سلطان محمود نے کہا۔ ”اور اُن کی یادگار کے طور پر دنیا بھی تعمیر کر دیا۔ جو۔“ شہیدوں کے پوتوں کو دارالعلوم میں مفت تعلیم اور وظیفہ ملانے لگا۔

”اور غورے سونو محمود! شیخ ابوالحسن خرقانی نے کہا۔ ”غور! اُسے لوگو! اُسے تمہارا

بڑی جسامت کا ہے جو ہندوستان میں کبھی نہیں دیکھا گیا۔ اس ہاتھی کی غولی صرف یہی نہیں تھی کہ اُس کی جسامت فرسولی تھی بلکہ وہ اس لیے بھی ملک بھر میں مشہور تھا کہ میدانِ جنگ میں دشمن کی صفوں میں دہشت اور تباہی پھیلا دیتا تھا اور دوسرے ہاتھیوں کی طرح پتھر بار بھی کھا کر پیچھے نہیں بھاگتا تھا۔ نڈر ہاتھی تھا۔

سلطان محمود نے اس کی کو اسی ہاتھی کے لیے محاصرے میں لے لیا تھا۔ یہ جھوٹی سی ریاست تھی۔ سلطان محمود نے چند رائے کو پیغام بھیجا کہ وہ اپنا ہاتھی دے دے تو بڑی آسان شرائط پر ہر صرہ اٹھالیا جائے گا۔ چند رائے نے جواب بھیجا کہ یہ ہاتھی مجھے اپنی راجدھانی اسالی سے زیادہ عزیز ہے۔ میں جب تک زندہ ہوں اس ہاتھی سے دستبردار نہیں ہوں گا۔ پھر یوں ہوا کہ دونوں فوجوں کا تصادم ہوا۔ اس دوران ہی ہاتھی شانہ چال چلتا سلطان محمود کے پاس آگیا۔ اس کے نودے میں اس کے جنگجو سواروں کی لاشیں پڑی تھیں جن کے جسموں میں تیرا تھمے ہوئے تھے۔ ہاتھی کی راہنمائی کرنے والا کوئی نہ تھا۔

سلطان محمود کے حکم سے ہاتھی کو پکڑ لیا گیا۔ یہ بعض اتفاق تھا کہ ہاتھی اپنے آپ آگیا۔ سلطان محمود نے بے ساختہ کہا۔ ”یہ ہاتھی مجھے چند رائے نے نہیں خدا نے دیا ہے۔“ چنانچہ سلطان نے اس کا نام خدا داد رکھ دیا۔

فرشتہ کے مطابق سلطان محمود ہندوستان سے ایک پرندہ لایا تھا جو فاختہ سے ملتا جلتا تھا۔ اسے قدرت نے یہ غولی عطا کی تھی کہ اس کا پتھر جس مکان یا محل میں لکھا ہوتا وہاں کوئی کسی کو زہر نہیں دے سکتا تھا۔ مکان یا محل کے کسی بھی کمرے میں کتنا ہی چپا کر گم کو زہر دیا جاتا تو یہ پرندہ پتھر سے میں بڑی طرح پھڑپھڑاتا تھا جیسے بیخودہ توڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس دوران اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے تھے۔ لوگ فوراً چوکنے ہو کر ہر جگہ جا کر دیکھتے کہ کون کسے زہر دے رہا ہے۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ سلطان محمود نے یہ پرندہ تنھے کے طور پر خلیفہ بغداد القادر باللہ کو بھیج دیا تھا۔

فرشتہ نے ہی سید مومنون کے حوالے سے لکھا ہے کہ سلطان محمود ہندوستان

”ایک فرق دیکھئے اور سمجھئے کی کوشش کرو۔ شیخ ابو الحسن خرقانی نے کہا: ایک دشمن ہندو کی سلطنت کے ہیں۔ وہ تم سے تخت و تاج چھیننا چاہتے ہیں اور ایک دشمن وہ ہیں جو اسلام کو کمزور کر رہے ہیں۔ انہیں غلہ کہتے ہیں۔ اپنے ذاتی دشمن اور اپنے مذہب کے دشمن ہیں نہ کہ دوسرے کو اس لیے قید میں نہ ڈال دو کہ وہ تمہارے جاہ و خیمت کا منکر ہے۔ اگر سدا اہلنا بیچارہ اپنی مبینہ اور اگر ہندو اسکا بھائی بھی اسلام کو نقصان پہنچا رہا ہے تو اسے جیئے۔ دے دے مجرم کر دو۔ کاشف کا حکمران قادر خان اور اس کے پڑوسی ابو منصور سلطان خان اور تو خان خان ہندو کی سلطنت پر قبضہ کرنے کی سعی کر رہے ہیں۔ وہ خارجہ جنگ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ وہ عالم اسلام کے اتحاد کو پارہ پارہ کر رہے ہیں۔ انہیں عیسائی مدد اور جواو سے رہے ہیں۔ اگر یہ نہ تھا تو انہیں کھل دیکھیں کھینے سے پہلے انہیں موقع دے دو کہ وہ سبھی سبکیں کر وہ غلط راستے پر چل رہے ہیں۔“

”آج تیس خزانے جو طاقت اور جواہر دھشت عطا کی ہے۔ یہ تم سے چھین بھی سکتی ہے۔ خوشامدیوں کے نعروں کی نسبت رعایا کی آہیں عرش تک جلدی پہنچتی ہیں۔ ہندوستان کی فتوحات نے تمہاری رعایا میں اضافہ کر دیا ہے۔ تمہاری ذمہ داریاں

یہ اپنے پاس رکھ لیا۔ ابو منصور کو اپنی بیٹی سمن تاش سے بہت پیار تھا۔ سمن تاش نابینا تھی تو اپنے کمرے میں بھی بلالیا کرتی تھی۔

”سمن!۔۔۔“ انہی نے جذباتی سہی آواز میں کہا۔ ”کتنی پیاری آواز ہے۔“

خمار سا طاری ہونے لگا ہے۔

”یہ مستعار نابینا ہے۔“ سمن تاش نے کہا۔ ”اسکھوں کے ٹھہرے مرد پیدا ہوئے تھے مگر خدا نے قدرت کی ساری لنگی اس کی آواز میں سودی ہے۔ بابا اجازت نہیں دیں گے۔ میں اس بھٹی کو سلطان محمود کے دربار میں لے جانا چاہتی ہوں۔“

”مہ کیوں؟“ انہی نے رکت کر پوچھا۔ ”سلطان محمود کے دربار میں کیوں؟“

”مستلہ اس کے ساتھ کیا تعلق ہے؟“

”جو ایک مسلمان کا ایک مسلمان کے ساتھ ہوتا ہے۔“ سمن تاش نے کہہ دیا۔

اس نابینا موسیقار کے ساز اور اس کی آواز سے سلطان محمود کی عقیدت کا اظہار کرنا چاہتی ہوں۔ تم نے سنا نہیں وہ ہندوستان میں کتنے بہت خانے توڑ آیا اور کتنے درباروں سے ہتھیار ڈولا آیا ہے۔“

”اس کی تمہیں کیا خوشی ہے؟“ انہی نے پوچھا۔ ”سلطان محمود ہمارے اور تمہارے خاندان کا دشمن ہے۔ وہ جو انہی گھوڑے، چوٹی قیدی اور اسلحہ لایا ہے، وہ سب ہمارے خلاف استعمال ہوگا۔ تم شاید اپنے خاندان کی تاریخ سے واقف نہیں ہو۔“

”میں اپنے خاندان کی تاریخ سے واقف ہوں، اسی لیے سلطان محمود کی ہتھیاروں سے سمن تاش نے کہا۔ ”وہ ہمارا دشمن نہیں بلکہ ہم دونوں کے خاندان اس کے دشمن ہیں۔“

وہ اسلام کا طلبہ وار ہے۔ بہت ننگن ہے۔ تم شاید نہیں جانتی کہ اس نے ہندوستان میں کتنے ہندوؤں کو شکست دی ہے لیکن وہاں حکومت کرنے کے لیے تخت پر نہیں جا بیٹھا۔“

”اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے وہ جو اہل دلت اور مل دلت کی خاطر ہندوستان جاتا ہے۔“ انہی نے بڑے پیار سے کہہ دیا۔ ”اب کے وہ درباروں کے جوابات دے رہا ہے۔“

”اس کے لاکر لایا ہے۔“ اس نے بے بسی لالہ غنیمت اپنی فرج میں تقسیم کیا ہے۔

سلطنت غازی کے مسلمان دشمنوں کا مختصر سا پس منظر یہ ہے کہ ایک خان زکریا نے ارد گرد کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے حکمرانوں کو اپنے ساتھ ملا کر سلطان محمود غزنوی کی بڑھتی ہوئی طاقت کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ آپ اس سلسلے میں تفصیل سے پڑھ چکے ہیں کہ کئی بار سلطان محمود کو ان کے خلاف لڑنا پڑا۔ ایک خان مرچکا تھا۔ اب اس کا بھائی ابو منصور ارسلان خان الہم تخت نشین تھا۔ اسے الہم اس لیے کہا جاتا تھا کہ کانل سے بہرہ تھا۔ کاشغر کا حکمران قادر خان تھا اور اس کے پڑوس میں توغان خان کی ریاست تھی۔ یہ دراصل ریاستیں نہیں بلکہ تین تین جو خلافت بغداد کے تحت تھیں مگر خلافت کی اہمیت ختم ہو چکی تھی خلیفہ القادر باللہ عباسی تھا جو خود تدار پرست تھا۔ وہ ایک ریاست کا حکمران بھی تھا۔ وہ سلطان محمود کے خلاف خانہ جنگی کو دہریں ہزار تار رہا تھا۔

سلطان محمود سترہ سے قنوج تک فتح کر کے واپس آیا تو ایک رات قادر خان ابو منصور ارسلان خان کے محل میں بیٹھا تھا۔ قادر خان کی ایک جوان بیٹی انہی بھی اس کے ساتھ آئی ہوئی تھی۔ رات کو جب قادر خان اور ابو منصور خاص کمرے میں بیٹھے رازدیننگ ایس کر رہے تھے، قادر خان کی بیٹی انہی اور ابو منصور کی جان بچی سمن تاش بدنام میں تھیں۔ رات خاموش تھی۔ صرف ایک آواز تھی جو اس سکوت میں زیر رہی تھی۔ یہ آواز کا ایک سا تھا جس کے ساتھ کوئی دھیمے دھیمے لگتا رہا تھا ساز اور آواز میں سوز تھا اور ایسا تاثر کہ جذبات پر وجہ طاری ہو جا رہا تھا۔

وہ نابینا موسیقار تھا۔ ابو منصور کے دربار کا معنی تھا سمن تاش نے اسے باغ کے کسی گوشے میں بٹھا رکھا تھا اور وہ خود انہی کے ساتھ ٹہل رہی تھی۔ نابینا بھٹی کی عمر تیس برس سے ذرا ہی زیادہ تھی۔ ڈیڑھ ایک سال سے ابو منصور کے دربار میں تھا۔ سمن تاش کو کوئی سنی سے ملی لگاؤ تھا۔ ایک مددگار نابینا محل کے باغ کے قریب آگیا اور اس نے تاروں کو چھیڑ دیا۔ سمن تاش کے کانوں میں آواز پڑی تو اس نے اسے اندھ بلالیا۔ ابو منصور نے اس سے ایک ہی ٹوٹا تو اس نے سنی کو ہینڈ کے

وہ نہیں اپنا ظلم بنانے کی تیاری کر رہا ہے۔

”میں تو اُس کی ٹونڈی سننے کو تیار ہوں۔“ سمن تاش نے کہا۔

”تم میں خاندانی غیرت نہیں رہی۔“ اُختی نے کہا۔ ”تم ایک خان کی بھتیجی ہو جو سلطان محمود کے خلاف لڑتا رہا ہے۔ تمہیں آبا کے کچھ بتایا نہیں؟“

”جی! ایک خان سلطان محمود کے خلاف لڑتا رہا ہے اور ہر میدان میں شکست کھاکر بھاگتا رہا ہے۔“ سمن تاش نے کہا۔ ”مجھے میرے ابا کی باتا سکتے ہیں؟....“

وہ بہرے ہیں۔ ان کے کانوں میں حق کی آواز نہیں پہنچتی۔ وہ اُسی کو سچ سمجھتے ہیں جو ان کے کانوں میں ڈالا جاتا ہے۔

”کیا تم اپنے باپ کو احق سمجھتی ہو سمن؟“ اُختی نے کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے خدا نے تمہیں عقل اور غیرت کی جگہ بھی جس ہی دے دیا ہے۔ کم از کم غزنی اور فراسان میں ہم جیسی خوبصورت لڑکی کوئی نہیں ہوگی لیکن تم عقل سے عاری ہو۔“

”مگر میرے ابا احق عقل سے عاری نہیں۔“ سمن تاش نے کہا۔ ”تم نے میرے

سفید ریش و عمر سیدہ ابا احق کو دیکھا ہے۔ وہ علم اور تجربے کا سمندر ہیں۔ وہ مجھے میرے

خاندان کی تاریخ سنا چکے ہیں۔ انہوں نے میرے ابا کے متعلق کہا تھا کہ ان میں تدبیر نہیں۔

میں نے کہا تھا کہ ان کی عبوری ہے کہ وہ بہرے ہیں۔ سمن تاش نے کہا کہ جو

کوئی سخت پریشہ کر سر پر تاج رکھ لیتا ہے وہ بہرہ ہو جاتا ہے۔ وہ بھتا ہے کہ سمن

ہے مگر سچ احق بات کے لیے اُس کے کان بند ہو جاتے ہیں۔ وہ بھتا ہے کہ وہ دیکھ

سکتا ہے مگر اُسے حقیقت نظر میں آتی۔ وہ بھتا ہے کہ اُس کا مبالغہ سوتیلے مگر بے گولوغ

پرکھ اور کا آسب سوار ہوتا ہے....

”اُختی! میرے ابا احق نے کہا تھا کہ ستارے باپ کا بڑا بیٹا ایک خان بہرہ نہیں

تھا۔ خدا نے اُسے عقل و دانش سے نوازا تھا مگر اُس نے اپنے دامغ پر غزنی کو فتح کرنے

اور سلطان محمود کو قید یا قتل کرنے کا بھوت سوار کر لیا۔ اُس کے جو کان سُن سکتے تھے وہ

بند ہو گئے۔ آٹھنیں جو دیکھ سکتی تھیں اندھی ہو گئیں اور عقل پر سلطان کی ہوس کا پردہ

پڑ گیا۔ ایسے حکمران کو جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔ ستارے جی! ایک خان نے بھی اپنی

رعایا سے جھوٹ بولے۔ اپنے دوستوں سے جھوٹ بولے۔ مسجدوں میں جھوٹ بولے۔ قرآن

ماخذ میں لے کر جھوٹ بولے۔ اپنی فوج کو اور اپنی رعایا سے کہا کہ سلطان محمود لڑ

ہے اور وہ اپنی سلطنت کو وسیع کر رہا ہے۔ ایک خان نے جھوٹی غیرت کی تیس کھڑی

اور اپنی فوج کو بھڑکا کر بھائی کو بھائی سے لڑا دیا۔ اسلام کی عسکری قوت کمزور ہو گئی اور

کفار کے ہاتھ مضبوط ہو گئے....

”میرے ابا احق نے مجھے بتایا کہ سلطان محمود اگر سلطنت کی وسعت کی خواہش

رکھتا تو اُس کے پاس اتنی فوج ہے کہ وہ ان چھوٹے چھوٹے حکمرانوں اور ننگران

کے خزانوں کا پناہ وسیع بنا چکا ہوتا لیکن اُس کی نظر کچھ اور دیکھ رہی ہے۔ اُس کا

جنون کچھ اور ہے۔ محمد بن تاتم نے ہندوستان میں جو اسلام پھیلا یا تھا اُس پر بندوبست

کے سائے پڑ گئے ہیں۔ سلطان محمود کو خواب میں بشارت ہوئی تھی کہ ہندوستان میں

اسلام کی لڑائی بھول شمع کو روشن کرے۔ اُس کے برادر خدشہ شیخ ابوالحسن فرقاتی ہیں جو

غیب دان تو نہیں لیکن علم و فضل اور ایمان کی روشنی انہیں وہ سب کچھ دکھا دیتی ہے

جو بے بھاد کم عقل انسانوں کو نظر نہیں آتا۔ شیخ فرقاتی نے سلطان محمود سے کہا ہے کہ کفر

کا اور اپنی قوم میں غلاموں کا خاتمہ کرو....

”میرے ابا احق نے کہا کہ جب بھائی بھائی سے لڑتا ہے تو ان کے خون کے

قطروں سے زمین کانپ کانپ جاتی ہے۔ آسمان آنسو بہاتا اور فرشتے روتے ہیں۔“

سمن تاش نے۔ اُختی نے سائے آکر اپنے ہاتھوں میں اُس کے گال تھام لیے

اور بولی۔ ”تم نے پہلے کبھی ایسی باتیں نہیں کی تھیں۔ اس عمر میں ایسی سنجیدہ باتیں تمہیں

اچھی نہیں لگ رہی، اور ستارا ابا احق تمہیں کھنی غلط باتیں بتا رہا ہے۔ وہ تمہیں اسی

عمر میں درویش بنا رہا ہے۔ ایسی خوبصورت رات، ایسا وجد آفریں غزل، تم کتنی بدفصل

ہوئی جا رہی ہو سمن!“

”روح کو جب روشنی مل جائے اُختی! سمن تاش نے کہا۔ میں بدفصل

نہیں۔ یہ نابینا موسیقار میرے ذوق کی بدولت دھاری رتبہ حاصل کیے ہوئے ہے۔

میں نے روح کی جس روشنی کی بات کی ہے وہ مجھے اپنے ابا احق اور اس موسیقار

کے نفوں سے ملی ہے جس محسوس کرتی ہوں کہ اس کے ساز کے تار کچھ بڑھ رہے ہیں۔ ان کے ترنم میں مجھے ایک پیغام سنائی دیتا ہے۔
”کیا ہے وہ پیغام؟“
”معلوم نہیں۔ سنناش نے کہا۔ میں ابھی سمجھتی نہیں۔“

نابینا موسیقار مادل پر آہستہ آہستہ مضراب چلا رہا تھا اور وہ خوابناک آواز میں گنگنا رہا تھا۔ گنگنا ہے اُس کی آواز ساز کی آواز، گنگنا ہے ساز کی آواز اُس کی آواز گنتی تھی۔ دونوں زبانیں بٹلتے بٹلتے اُس کے قریب آگئیں موسیقار پر بے خودی طاری تھی اور وہ جیسے کسی ادنیٰ موجودگی سے بے خبر تھا۔
”کیا تم اپنے آباؤ اجداد کو قائل کر سکتی ہو کہ سلطان محمود اپنی سلطنت کی توسیع نہیں چاہتا۔“
”اُختی نے پوچھا۔“ اور کیا تمہارے آباؤ اجداد جانتے تھے کہ سلطان محمود کی جگہیں اسلام کی خاطر ہیں؟“

مہ نہیں منوانے کی کچھ کی ضرورت ہے؟ سنناش نے کہا۔ وہ سلطان محمود کے خلاف ہو سکتے ہیں، اُس کے خلاف لڑیں گے نہیں۔ ان کے دل میں دشمنی موجود ہے۔ وہ سلطان کے خلاف لڑیں گے بھی نہیں اور اس کی مدد بھی نہیں کریں گے۔
”میں تمہیں راز کی ایک بات بتاؤں گا۔“ اُختی نے کہا۔ ”تمہارے آباؤ اجداد سلطان محمود کے خلاف لڑنے کی تیاری کر رہے ہیں۔“
”وہ ایسی جرات نہیں کریں گے۔“

”وہ ایسی جرات کا اظہار کر چکے ہیں۔“ تادر خان کی بیٹی اُختی نے کہا۔
”میرے آبا اسی قصہ کے لیے یہاں آئے ہیں۔ وہ تمہارے آبا کے ساتھ اسی سلسلے میں بات کر رہے ہیں۔“

”میں انہیں روکوں گی۔“ سنناش نے تڑپ کر کہا۔

”ہوش میں آؤ سن! اُختی نے قدرے خفیلی آواز میں کہا۔ ”ترک ان کی بیٹیاں اتنی بے غیرت نہیں ہو کر تیں۔ تم ذہنی طور پر غزنی والوں کی غلام بن گئی ہو۔“

نابینا موسیقار کے ساز کے تار اتنی ندر سے جھنجھائے جیسے اُس کا ہاتھ کانپ گیا ہو اور مضراب بے قابو ہو گیا ہو۔ ماز خاموش ہو گئے، مغنی کی آواز رات کے کھٹ میں گھٹیل ہو گئی۔

”سلطان محمود بہت بڑی طاقت بن گیا ہے۔“ اُختی کو بڑی تھی۔ ”اب تمام ترکستان پر اسی طرح حملہ اور قبضہ کرے گا جس طرح اُس نے خوارزم پر کیا تھا۔ کیا تم بھول گئی ہو کہ اب خوارزم شاہ کون ہے؟... الظفاش!۔۔۔ اور اُس کا نائب سلطان محمود کا مشہور سالار ارسلان جاذب ہے۔ یہ دونوں غزنی کے قصاب ہیں۔ انہوں نے ہر اُس آدمی کو قتل کر دیا ہے جن کے متعلق انہیں شک تھا کہ غزنی کے خادما نہیں۔“
”ہم دونوں کے والد کیا کرنا چاہتے ہیں؟“

”خراسان پر حملہ۔“ اُختی نے کہا۔ ”میرے اُس کے کہ سلطان محمود کو اطلاع ملے، خراسان ہمارے قبضے میں ہو گا۔“

”اور جب سلطان محمود جہاں حملہ کرے گا تو اس کا مقابلہ کون کرے گا؟“
”میرے آباؤ اجداد درخان، تمہارے آباؤ اجداد ہر سجاد کے امیر الیگین کا بھائی توغان خان۔“ اُختی نے جواب دیا۔ ”ترکستان کے تمام امرا کو ایک ہی باز پر بکھٹایا جا رہا ہے۔“

”سنناش ہنسے گی اور ہنستی ہی چلی گئی۔ اس کی ہنسی میں بچپن کا انداز تھا لیکن اس ہنسی میں طنز تھی۔ اُس نے کہا۔ ”کیا چوبے اور چھبکیاں مل کر ایک شہر کا مقابلہ کر سکتی ہیں؟“

”اگر شہر زندہ ہی نہ رہا تو؟“ اُختی نے کہا۔

”زندہ نہ رہا تو؟“ سنناش نے حیران سا ہونے کہا۔
”اُسے خراسان پر حملے سے پہلے قتل کر دیا جائے گا۔“ اُختی نے کہا اور چونک کر بول۔ ”شہدا موسیقار سو گیا ہے یا چلا گیا ہے؟“

”رات کی خاموشی میں ساز کی دھیمی دھیمی، ازسلی کا بستی آواز ابھرے گی اور اس کے ساتھ نابینا مغنی کی آواز کی دہلی دہلی میٹھی میٹھی گونج سنائی دے گی۔“

”یہ خاموش کیوں ہو گیا تھا؟“ — اخشی نے پوچھا۔ ”یہ ہماری باتیں سننے کے لیے چپ ہو گیا تھا۔“

”ایک اندھے موسیقار سے اتنا خوف ہا سمن تاش نے کہا۔ اُسے موسیقی کے سوا کچھ اور چیز کے ساتھ ذرہ بھر دیکھی نہیں۔“

”خشی سمن تاش کو بزدل سے بڑا کر بڑے لگتی اور بولی ”تمہیں کچھ بھی معلوم نہیں۔ سلطان محمود کے جاسوس اور مخبر ہر جگہ موجود ہیں میرے آبا پائے ہاں غزنی کے وڈھوسوں کو پکڑ کر جلا دے والے کرچے ہیں۔ جاسوس تمہارے ہاں بھی موجود ہیں۔“

”آنکھوں سے محروم، موسیقی میں ڈوبا ہوا انسان جاسوس نہیں ہو سکتا“ سمن تاش نے کہا۔ ”تم مجھے بتاؤ کہ سلطان محمود کو کب اور کس طرح قتل کیا جائے گا۔“

”اس کا فیصلہ آج ہو جائے گا۔“ اخشی نے کہا۔ ”سمن تاش استبداد اتالیق بھی غزنی کا جاسوس معلوم ہوتا ہے، وہ نہ ترکستان کے اتنے بڑے دشمن کو وہ اسلام کا علمبردار نہ کہتا۔ اگر تم اپنے آبا کی زندگی چاہتی ہو تو اتالیق کی باتوں کو بیچ ماننا چھوڑ دو۔ یہ فرانت بڑھا نہیں گمراہ کر رہا ہے۔“

”سمن تاش کی زبان جیسے گنگ ہو گئی ہو۔“ اخشی بولتی رہی اور وہ سنتی رہی۔ ”خشی! سمن تاش اتنے بڑے اور کچھ گھبرائے ہوئے لمحے میں بولی۔“ ”ہمیں چلنا چاہیے۔۔۔۔۔۔ ہم سچو۔ میں موسیقار کو اس کے ٹھکانے پر پھونڈنے جا رہی ہوں۔“ ”کیسی بلازم کو اس کے ساتھ بھیج دو۔“ اخشی نے کہا۔ ”تم خود کیوں جاؤ گی؟“ ”سمن تاش نے کوئی جواب نہ دیا اور وہ موسیقار کی طرف چل پڑی۔“

ناہینا موسیقار کو محل کے قریب ہی مکان دیا گیا تھا۔ سمن تاش اُس کا ہاتھ پکڑے۔ ”اُسے اُس کے کمرے میں لے گئی۔ راستے میں وہ کچھ بھی نہ بولی۔ موسیقار کے کمرے سے نکلنے لگی تو موسیقار نے اُسے روک جانے کو کہا۔“

”آپ شہزادی ہیں، میں آپ کا خادم ہوں۔ موسیقار نے بڑے اداس لہجے میں کہا۔“ ”ایک بات کہیں تو برا نہ ماننا شہزادی!۔۔۔ مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔“

”کیوں؟“

”خان قادر خان کی شہزادی نے مجھے جاسوس کہا تھا۔ موسیقار نے کہا۔“ ”کہتی تھی کہ میں آپ دونوں کی باتیں سننے کے لیے خاموش ہو گیا تھا۔۔۔۔۔۔ سمن شہزادی! مجھے بادشاہوں اور سلطانوں کے ساتھ کوئی دیکھی نہیں۔ میرے لیے دنیا کبھی ختم نہ ہونے والی تاریکی اور آوازیں ہیں۔ اسے میں اپنے نعروں سے روشن رکھتا ہوں۔“ ”نہیں! سمن تاش نے کہا۔“ اُس نے تمہیں جاسوس نہیں بلکہ یہ کہا تھا کہ دھیمے سُروں میں بہکتے بہکتے تمہارے ساز کے تار بڑی زور سے جھنجھٹائے تھے اور تم خاموش ہو گئے تھے۔ اُسے شک ہوا تھا کہ تم ہماری باتیں سننے کے لیے چپ ہو گئے تھے۔“

”قادر خان کی شہزادی کے منہ سے سلطان محمود کے قتل کی بات نکلی تو میرا ہاتھ کانپ اُٹا۔ زہر مضراب بے قابو ہو کر تامل کو جالگا۔“ ”میں غمغنی بن گئی۔“ ”اور میری زبان کانپ کر خاموش ہو گئی۔“

”اگر سلطان محمود قتل ہو جائے تو کیا قیامت ہو جائے گی؟“ سمن تاش نے پوچھا۔ ”سلطان ہو یا پادشاہی کسی کو قتل نہیں ہونا چاہیے۔“ ”مٹی نے کہا۔“ ”اد میں جانتا ہوں کہ آپ سلطان محمود کو پسند کرتی ہیں۔ اگر وہ قتل ہو جائے تو مجھ پر وہی قیامت آئے گی جو آپ پر رونے لگی۔ آپ کی طرح میں بھی سلطان محمود کو اسلام کا علمبردار اور پادشاہان سمجھتا ہوں۔“

”لیکن یہاں کسی کے ساتھ اُس کے حق میں کوئی بات نہ کرنا۔“ سمن تاش نے کہا۔ ”اُسے کون قتل کرے گا؟“ ”موسیقار نے پوچھا۔“ ”اُسے کب قتل کیا جائے گا؟“ ”میں ابھی ان سوالوں کے جواب نہیں دے سکتی۔“ سمن تاش نے کہا۔ ”تم اب آرام کرو۔“

”نداؤنگ جلد شہزادی موسیقار نے کہا۔“ ”میں آرام نہیں کر سکتی۔ میں سو نہیں سکتی۔“

”تم دونوں کے چہرے بتا رہے ہیں کہ کوئی خاص بات ہوئی ہے۔“ ابو منصور نے کہا۔

”سن تاش کی ماں نے ابو منصور کے کان کے ساتھ سن لگا کر اپنا راز سے کہا۔ آپ ہمارے چہرے دیکھ رہے ہیں۔ اگر آپ ہماری آنکھوں میں جھانکیں تو آپ کو اسلام کے پیروں کی خوشگام لاشیں تپتی نظر آئیں گی۔ آپ کو اسلام کا چہرہ خاک و خون میں پڑا دکھائی دے گا۔۔۔ میری آنکھوں میں دیکھیں۔ آپ کو ایک ہی مذہب کے پیروں، ایک ہی خدا اور ایک رسول کا کل پڑھنے والے ایک دوسرے کا خون بہاتے نظر آئیں گے۔“

”خاموش ہو جاؤ۔“ ابو منصور نے گرج کر کہا: ”میں میرے نیٹیلوں میں دخل دینے کی جرات کیسے ہوئی ہے؟“

”جیسے اُس وقت جرات ہو کر تھی جب میں جوان تھی۔“ سن تاش کی ماں نے کہا۔ ”میرے جسم میں دل کشی تھی اور چہرے کا حسن تو مازہ تھا۔ آج میری جگہ پانچ جوان لڑکوں نے لے لی ہے۔ خدا نے آپ کے کان بند کر رکھے ہیں اور عقل پر پانچ لڑکیاں قابض ہو گئی ہیں۔ آپ سوچ نہیں سکتے، سمجھ نہیں سکتے کہ ان میں دو لڑکیاں جو تھکے کے طہر پر آئی ہوئی ہیں وہ کس نے کس نسبت سے بھیجی ہیں۔“

”لیکن جو اختیار نہیں حاصل ہے وہ میں نے کسی اور کو نہیں دیا۔“ ابو منصور نے کہا۔ ”تم نہیں جانتیں کہ ہم نے سلطان محمود پر بیٹھا ہر ایک کریم زندہ ہیں اور ہمیں طاقت ہے تو وہ ہیں غلام کی طرح بچل جائے گا۔ جانتی ہو وہ کتنا طاقتور ہو گیا ہے؟“

”آپ کو یہ کس نے بتایا ہے کہ وہ آپ کو گھٹنے کے لیے طاقتور ہوا ہے؟“ سن تاش نے اُس کے دوسرے کان کے ساتھ سن لگا کر بلند آواز سے کہا۔ ”یہ دہم ترکستانوں کو ہو گا۔ وہ آپ کو استعمال کر رہے ہیں۔“

”قائد خان پر مجھے بھروسہ ہے۔“ ابو منصور نے کہا۔ ”میں اُس کی بات نہیں کر سکتا۔“

”کیونکہ وہ اپنی جوانی کو ساتھ لایا ہے۔“ اس کی بیوی نے کہا۔ ”اور یہ لڑکی جس طرح آپ کے ساتھ گئی جیبتی تھی اور جس ناز و انداز سے آپ کے ساتھ باتیں کر رہی تھی وہ میں دیکھ رہی تھی۔ کیا آپ ایک لڑکی کی خاطر اپنی فوج کو غزنی والوں سے دریغ کر دیں گے؟“

”تم کر بھی کیا سکتے ہو؟“ سن تاش نے کہا۔ ”تم خانہ جنگی نہیں روک سکتے۔ تم غزنی کے سلطان کو قاتلوں سے نہیں بچا سکتے۔“

”اگر آپ مجھے کچھ بتا سکیں تو میں غزنی جا کر سلطان محمود کو قتل از وقت خبردار کر سکتا ہوں۔“

”سن تاش نے سنسن کر کہا۔ تم بہت جلد باتی ہو۔ تم غزنی کیسے جاؤ گے؟“
”مگر تا پڑتا چلا جاؤں گا۔“ منی نے کہا۔ ”یہاں میرے کچھ شاگرد بھی ہیں۔ رہے کموں گا وہ چلا جائے گا۔“

”کیا تم اس معاملے میں یقین ہو؟“ سن تاش نے کہا۔ ”جو کہ ہے ہو نہ کر کے دکھا سکتے ہو؟“

”آپ رانگ بات بتا دیں۔ باتی کام میں کسی سے کھلوں گا۔“ موسیقار نے کہا۔ ”شہزادی سن! میں نے سلطان محمود کے متعلق اپنی رائے آپ کی رائے سن کر دی ہے۔“
”بھئی کو پتہ نہ چلے کہ ہمارے درمیان یہ باتیں ہوئی ہیں۔“ سن تاش نے کہا۔

”اے سن تاش نے اپنی ماں سے جا کر کہا۔“ کیا اب حضور اپنے خاندان کی عادت کو مرنے نہیں دیں گے؟“
”کیسی روایت بنی؟“

”کیا آپ کو معلوم نہیں کہ کاشغر کا خان کیوں آیا ہے؟“ سن تاش نے کہا۔ ”خراسان پر حملے کی تیاری ہو رہی ہے۔ قائد خان ہمارے آباؤ اجداد کا ایک خان کے راتے پرے جا رہا ہے۔ ہمارے خاندان کے ابھی پہلے خیم نہیں بے۔۔۔ کیا آپ نہیں دیکھ سکتی ہیں؟“

”اتنے میں کمرے کا دروازہ کھلا اور سن تاش کا باپ ابو منصور درسلان خان کمرے میں داخل ہوا۔ وہ بہت اونچی آواز میں ملبتا تھا۔ اپنی بیوی اور لڑکی کو دیکھ کر کہہ گیا اسلانیس بڑی غور سے دیکھنے لگا۔ سن تاش کی ماں نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔“

یا۔

اگلی صبح قادری خان رخصت ہو رہا تھا۔ سن تاش نے نابینا موسیقار کو اپنے کمرے میں بلا رکھا تھا۔

”تم نے کہا تھا کہ میں تمہیں راز کی بات بتا دوں تو تم غل تک پہنچا سکتے ہو“۔
سن تاش نے کہا۔ ”مجھے یہ بتاؤ کہ میں تم پر اعتبار کس طرح کر سکتی ہوں اور دوسرے یہ کو غل پہنچا لے کر کون جائے گا۔“

”میرے پاس ایسا کوئی طریقہ نہیں جس سے میں آپ کو یقین دلا سکوں کہ میں قابلِ اعتمادی ہوں۔“ نابینا سنی نے کہا۔ ”اگر آپ کا ایمان دہی ہے جو میرا ہے تو آپ کو مجھ پر اعتبار کرنا چاہیے۔۔۔۔۔ آپ مجھ سے یہ نہ پوچھیں کہ غل کون جائے گا ایک گھوڑے کا انتظام کریں اور گھوڑے کی بالک میرے ہاتھ میں دے دیں۔ میں آپ کی نظریں سے اوجھل ہو جاؤں گا۔ میں بہت دن غائب رہوں گا پھر آپ کے پاس آ جاؤں گا۔“
سن تاش نے قرآن پاک اٹھایا اور چوم کر موسیقار کے ہاتھوں پر رکھ دیا۔ موسیقار نے بھی قرآن کو چوما۔

”یہ قرآن پاک ہے۔“ سن تاش نے کہا ”قسم کھاؤ کہ تم مجھے دھوکہ نہیں دے گے۔“
”نہیں شہزادی! موسیقار نے کہا۔ میں قسم نہیں کھاؤں گا۔ قسم کھانے سے کسی کی مدد کا آئینہ شفاف نہیں ہو جاتا۔ سب سے زیادہ اور بڑی قسمیں بے ایمان اور بددیانت آدمی کھا کر کرتے ہیں۔ یہ قرآن پاک میرے ساتھ رہے گا۔ مجھے اس کی مدد کی ضرورت ہے۔ واپس آؤں گا تو آپ کو کوئی دہن گا۔۔۔۔۔ آدمی کب بھیجا جائے؟“
”اگلی“ سن تاش نے کہا۔ ”بتاؤ آدمی ابھی مدافہ ہو سکتا ہے؟“

”ہو سکتا ہے۔“ نابینا سنی نے کہا۔ ”آپ گھوڑا لائیں اور بتائیں کہ کیا کیل ہے۔“
”تمہارے آؤں کو سلطان محمد کے پاس جانا ہے۔“ سن تاش نے کہا۔ ”اُسے کہنا کہ قادری خان اور توغان خان اور ابو منصور بل کر فراسان پر حملہ کرنے والے ہیں اور آپ کے قتل کا منصوبہ بھی تیار ہے۔ سلطان سے کہنا کہ آپ کو یقین نہیں آئے گا کہ ایک آدمی اپنے

”خانہ جنگی سے آپ نے پہلے کیا حاصل کیا ہے؟“ سن تاش نے کہا۔
”آپ کا بھائی ایک خان ایک ڈسے ہوئے اور خرد و حکمران کی زندگی بسر کرتا رہا۔“
”اُس کی زندگی؟“ نے کہا۔ ”اُسے شکست دے کر بھی سلطان محمود نے اُس کی ریاست پر قبضہ نہیں کیا تھا۔“

ابو منصور کے ایک بہن کے ساتھ اُس کی بیوی نے سزا دیکھا تھا اور دوسرے سال کے ساتھ اُس کی بیوی سن تاش نے وہ اسے چلا چلا کر بھاری پھیس کو وہ دوسروں کے کھنے میں نہ آئے۔ وہ بولنے لگتا تھا تو بیوی باہمی اُسے ٹوک دیتی تھی۔
”خدا کے لیے میری سزا۔“ اُس نے گرج کر کہا۔ میں مجبور ہو گیا ہوں۔ ایک طرف سلطان محمود ہے اور دوسری طرف قادری خان اور توغان خان۔ اگر میں ان کا ساتھ نہیں دیتا تو مجھے ان دونوں سے خطرہ ہے اور اگر میں ان کا ساتھ دیتا ہوں تو سلطان محمود سے دشمنی مسلیم لیتا ہوں۔“

”تو سلطان محمود سے دشمنی کر لیں۔“ اُس کی بیوی نے کہا۔
”میں خانہ دانی دشمنی کو دوستی میں نہیں بدل سکتا۔“ ابو منصور نے بھڑک کر کہا۔ ”میں سلطان محمود سے اپنے خاندان کی بے عزتی کا انتقام لوں گا۔۔۔۔۔ اور اب میں کس طرح پیچھے ہٹ سکتا ہوں۔ ہم نے فیصلہ کر لیا ہے منصوبہ طے ہو چکا ہے۔“

”جس میں سلطان محمود کا قتل بھی شامل ہے۔“ سن تاش نے طنز کیا۔
”ماں بیٹی نے ایک دوسری طرف دیکھا اور سن تاش نے دھیمی سی آواز میں ماں سے کہا کہ اپنا تدبیر بدل لو اور ان سے صلہ کر دو کہ ان کا منصوبہ کیا ہے۔ ابو منصور فحش سے ہنسنے لگا۔

”اگر آپ نے منصوبہ بھی تیار کر لیا ہے تو ہم آپ سے یہی کہیں گی کہ آپ پیچھے نہ ہٹیں۔“
”سن تاش کی ماں نے کہا۔ ہم آپ کی جو صدا فرمائی کریں گی۔۔۔۔۔ آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟ ہمیں بھی بتادیں تاکہ ہم بھی منصوبہ کی کاپیائی کے لیے کچھ کریں۔“

ابو منصور اور سلطان کی باپچیں کھل گئیں اور اُس نے فراسان پر اپنی، قادری خان اور توغان خان کی متحدہ فوج کے چلے اور سلطان محمود کے قتل کا منصوبہ پوری تفصیل سے سنا

”تو چلے جا“ سن تاش نے کہا ”سلطان محمود سے کہنا کہ میرے باپ کو بدستی کا پیغام بھیجو اور اسے یقین دلاؤ کہ غزنی کی فوج اسے قادرخان اور توخان خان سے بچائے رکھے گی“

ایک گھوڑا شہر میں سے گزر رہا تھا۔ اس کی باگیں کڑے ہوئے ایک نابینا دھڑکے ہاتھ میں لٹکی اٹھائے چلا جا رہا تھا۔ اُس کے گھوڑے کے ساتھ سبز بندھا ہوا تھا۔ اُس نے اپنے کندھے سے کمان اور ترکش بھی لٹکا رکھا تھا۔ اُسے بہت کم لوگ جانتے تھے اور جو اُسے نابینا ختی کے نام سے جانتے تھے وہ اسے دیکھ کر سنسن پڑتے تھے کہ اندھا ترکش اور کمان لیے جا رہا ہے۔

گھوڑا شہر کے دروازے سے نکل گیا۔ وہ نابینا موسیقار تھا۔ وہ گھوڑے کے آگے آگے پہل چل رہا تھا۔ شہر سے کچھ دور جا کر گھوڑے پر سوار ہو گیا اور اُس نے لٹکی پھینک دی اور آگے جا کر اُس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ گھوڑا دوڑ پڑا لیکن اُس نے گھوڑے کو سرپٹ نہ دوڑنے دیا۔ سوار اندھا تھا مگر وہ خود اعتمادی سے سواری کر رہا تھا اور گھوڑا صحیح راستہ پر جا رہا تھا۔

بندہ سولہ میل بعد وہ پہلی شہر کا ہو گیا جو ابراہیم نذر کی شکار گاہ تھی۔ وہاں اپنی بیٹی لڑکیاں اور کھدائے بھی تھے۔ اس علاقے کے ہرن مشہور تھے۔ نابینا موسیقار کا گھوڑا چلا جا رہا تھا کہ ایک ہرن سارے سے دھڑا گزرا۔ ہرن کی رفتار کم ہوتی جا رہی تھی کیونکہ اُس کے پیلوں میں دو تیراڑے ہوئے تھے۔ نابینا موسیقار نے اس کے پیچھے گھوڑا ڈال دیا۔ ہرن کے تعاقب میں کچھ گھوڑے دھڑے آ رہے تھے لیکن وہ دور تھے تب نابینا موسیقار کا گھوڑا ہرن کے قریب پہنچ رہا تھا۔ موسیقار نے کندھے سے کمان آدھی اور ترکش سے تر نکال کر ہرن پر تیر چلایا۔ تیر ہرن کی پھلی ہانگ میں اتر گیا اور ہرن کی رفتار پھل ختم ہو گئی۔ وہ رکا اور مچ گیا۔

موسیقار نے اس کے قریب جا گھوڑا بند کا اور اُدھر دیکھنے لگا جب شہر سے ہرن کے تعاقب میں گھوڑے دوڑے آ رہے تھے۔ وہ بہت سے سوار تھے۔ نابینا موسیقار

باپ کے خلاف سباز میں شامل ہو سکتی ہے لیکن مجھے آپ پہلے اسلام کی بیٹی تھیں، اس کے بعد مجھے اپنی بیٹی تھیں اور اس کے بعد میں اس باپ کی بیٹی ہوں جسے اپنے مذہب کی بجائے اپنا مذہب دنا ہے سارا ہے سلطان سے کہنا کہ میں جانتی ہوں کہ یہ بیٹوں مل کر کب کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ آپ انہیں ایک ہتھ میں صاف کر دیں گے لیکن جو کشت و خون ہو گا۔ اسے تصور میں لائیں۔ غزنی، خراسان، خوارزم، بلخ اور بخارا کی وہ مائیں جن کے جوان بیٹے آپس میں زکر مار رہے تھے۔ آج بھی اُسی طرح موتی ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کی لاشیں دیکھ کر موتی تھیں۔ ان کی آہوں اور فریادوں سے زمین و آسمان کانپ رہے ہیں....

غزنی کے سلطان سے کہنا کہ میرا باپ قادرخان اور توخان خان سے خائف ہے۔ آپ میرے باپ کو صلح اور بدستی کا پیغام بھیج کر اس کے دل سے یہ خوف نکال سکے ہیں۔ مجھے اپنی بیٹی سمجھنے ہوئے فوجوں کو کٹ مرنے سے بچائیں۔ مجھے اپنے شہم ہو جانے کا کوئی علم نہیں ہو گا۔ میری ماں کو جوہ ہو جانے کا رنج نہیں ہو گا۔ علم اور رنج ہو گا تو یہ کہ جنہیں کفر کے خلاف جہاد میں شریک ہونا تھا وہ خانہ جنگی میں کٹ مرے اور کفر کے ہاتھ مضبوط ہونے... کیا تم یہ ساری باتیں یاد رکھ سکو گے؟ جس طرح میں بتا رہی ہوں اسی طرح اُس آدمی کو بتا سکو گے جو غزنی جا رہا ہے؟

اُسی طرح بتاؤں گا۔ نابینا موسیقار نے کہا۔ اور وہ سلطان محمود کو اسی طرح سنائے گا۔

”نہیں“ سن تاش نے کہا۔ تم موسیقی میں ڈوبے ہوئے انسان میرے جذبات کی ترجمانی نہیں کر سکو گے۔ تم اپنی دنیا میں گم رہنے والے انسان اس دنیا کو نہیں جانتے جس میں انسان اپنی بادشاہی کی خاطر بیچنا، انسانوں کا خون بہا دیتا اور دنیا پر مذہب کا جنون طاری کیے رکھتا ہے۔

”سن شہزادی! نابینا موسیقار نے کہا۔ الفاظ کے بھنور سے ہاتھ لڑا۔ مجھے بتاؤ کہ سلطان تک اور کیا پیغام پہنچا ہے۔ میں سب کچھ سمجھتا ہوں اور میں سب کچھ سمجھا

ہرن کو دیکھ رہا تھا۔ گھوڑے اُس کے قریب آؤ گے۔ تب اُس نے سواروں کو دیکھا۔
”میں نے آپ کے ہرن کو گرا لیا ہے۔“ ناینا موسیقار نے سواروں سے کہا اور وہ
گھبرا گیا۔ اُس نے سواروں کو پہچان لیا تھا۔

سوار بھی اسے دیکھ کر حیران ہوئے۔ ان میں ایک قادر خان تھا اور اُس کے ساتھ
دوسرے گھوڑے پر اُس کی بیٹی اُخشی سوار تھی۔ باقی سب قادر خان کے شیردار مقرر تھے۔
قادر خان اُسی روز ابو منصور سے زحمت ہو گیا تھا اور راستے میں اس نے سکار کھیلنا شروع
کر دیا تھا۔ اس ہرن کو ایک شیر اُس کا اردو سر اُخشی کا لگا تھا۔ شیر اتر ناینا موسیقار
نے چلا کر ہرن کو گرا دیا۔

”کیا تم ناینا منی نہیں ہو جس نے میں ابو منصور ارسلان کے ہاں نفے سنائے تھے؟“
— قادر خان نے پوچھا۔

اُس کا سار گھوڑے کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ اُخشی نے اپنا گھوڑا موسیقار کے
گھوڑے کے قریب کر کے اُس کی زین کے ساتھ ساند لایا بندھا ہوا تھیل لکھ لیا۔
موسیقار بت بن گیا۔ تھیلے میں سے ساند نکالا گیا۔ اس میں کوئی شک نہ رہا کہ یہ وہی
ناینا موسیقار ہے۔

”مجھے پہلے ہی شک تھا کہ یہ جاسوس ہے۔“ قادر خان کی بیٹی اُخشی نے کہا۔
”کیا کر لی اندھا تیر سے ہرن کو نشانہ بنا سکتا ہے؟“

قادر خان نے غور نکال کر کہا۔ ”جرح بتا ہمارا ہی اہلیت کیا ہے؟“
قادر خان کے محافظ ابھی اس کا گھیراؤ کرنے کے لیے پہلے ہی تھے کہ موسیقار نے
گھوڑے کی رکام کو جھٹکا دیا اور اڑنے لگا۔ گھوڑا شاہی اصطبل کا تھا۔ اشارہ ملے ہی
سرپرست وہ بڑھا۔ قادر خان نے حکم دیا۔ ”پکڑو اسے۔“ محافظوں نے اُس کے پیچھے گھوڑے
ڈال دیے۔ مگر موسیقار بہت فاصلے گیا تھا اور وہ ایک ٹکری کی اوٹ میں چلا گیا تھا۔
محافظ اُس پر تیر نہیں چلا سکتے تھے۔ وہ اُس کے تعاقب میں رہے۔

موسیقار بڑا اچھا سوار تھا۔ اُس نے گھوڑے کو سست نہ ہونے دیا۔ گھوڑا کھڑ
بھلا غٹا جا رہا تھا۔ بہت دُور جا کر موسیقار نے پیچھے دیکھا۔ اس کے تعاقب میں آئے

دالے بہت دُور تھے۔ انہوں نے باورس ہو کر تعاقب ترک کر دیا اور واپس چلے گئے۔

ابو منصور کو اطلاع ملی کہ قادر خان جو زحمت ہو گیا تھا واپس آ گیا ہے۔ ابو منصور
دوڑا ہار گیا۔ قادر خان نے اُسے بتایا کہ اس کے دربار کا ناینا منی ناینا منیس اور وہ بھاگ
گیا ہے۔

”وہ سلطان محمود کا جاسوس ہے۔“ قادر خان نے کہا۔ ”ہماری رات کی باتیں
سن گیا ہو گا۔“

”رات کو وہ اس کمرے کے قریب بھی نہیں تھا جس میں ہم باتیں کر رہے تھے۔“
— ابو منصور نے کہا۔ ”اہم معلوم کریں گے وہ رات کہاں تھا۔“

”مجھے آپ کی بیٹی پر شک ہے۔“ قادر خان کی بیٹی اُخشی نے کہا۔ ”وہ سلطان محمود
کی نیندالی ہے اور یہ موسیقار اُس کا منظور نکر تھا۔ مجھے آپ کی بیٹی کے بوڑھے آتالیق پر
بھی شک ہے کہ وہ غدار ہے۔“

ابو منصور سوچ میں پڑ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ سن تاش سلطان محمود کے خلاف ’رائی‘
کے تحت خلاف ہے۔ اس کے آتالیق کے متعلق اُسے معلوم نہیں تھا۔ قادر خان اس تاشی
ابو منصور کے پیچھے بڑھنے لگا کہ وہ آتالیق اور اپنی بیٹی کے خلاف کچھ کرے مگر ابو منصور اپنی
بیٹی کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پھر بھی دونوں کو بلا لیا گیا۔ جب سن تاش
سے یہ کہا گیا کہ ناینا موسیقار ناینا نہیں تھا تو وہ بہت حیران ہوئی۔ وہ مان نہیں رہی تھی۔
”سنو بڑھے۔“ قادر خان نے آتالیق سے کہا۔ ”تم جس کا نامک کھاتے ہو اُسی
کے خلاف عذاری کرتے ہو۔ اگر بتاؤ کہ وہ موسیقار یہاں سے کیا خبر لے گیا ہے تو ہم
نہیں بخش دیں گے ورنہ بہت بڑی موت مرد گئے۔“

”خبردار!۔“ سن تاش اپنے آتالیق کے سامنے کھڑی ہو گئی اور قادر خان سے کہا
— ”اگر میرے آتالیق کی کسی نے توہین کی تو کوئی نہیں بتا سکتا۔ یہاں کیا ہو گا۔ ہم
کاشغر کے غلام نہیں۔“

”ایک طرف ہو جاؤ سن!۔“ آتالیق نے قادر خان سے کہا۔ ”ایک ذرا سے

مغلط کی بادشاہی تہیں خدا نہیں بنا سکتی۔ میں سلطان محمد کا حامی نہیں تھی کا حامی ہوں۔ میں موسیقار کو اندھا سمجھتا رہا۔ میں تم سب کو اندھا سمجھتا ہوں۔ اگر وہ اندھا غزنی کا جاسوس تھا تو وہ اسٹیکوں کا اندھا تھا۔ مدح کا اندھا نہیں تھا۔ اُس کے اندھ انسان کی روشنی تھی۔ مجھے کچھ خبر نہیں کہ وہ کیا خبر لے گیا ہے لیکن میں یہ کہنے سے بالکل نہیں ڈر رہی گا کہ وہ اگر جاسوس تھا تو بیکامسان تھا۔“

قادر خان نے ابو منصور کے کان کے ساتھ منہ لگا کر بند آواز سے کہا۔ ”اُس بوزرھے کو قید خانے میں ڈال دیں۔ یہ ہماری جڑوں کاٹ رہا ہے۔“

ابو منصور نے آتالیق کی طرف دیکھا۔ اُسے شاید یاد آگیا ہو گا کہ یہ بزرگ صورت انسان جو ہرگز آخری منزل کے قریب پہنچ چکا تھا، اُس کے باپ کا بھی آتالیق تھا۔ اُس کا آتالیق بھی یہی تھا اور اب اس کی بیٹی بھی اس سے تعلیم و تربیت حاصل کر رہی تھی۔

”آپ اس کا حکم مانیں گے یا اپنے خدا کا؟“ بزرگ آتالیق نے کہا۔ ”اگر آپ کو دنیا عزیز ہے تو میں آپ کو بتا دیتا ہوں کہ شکست آپ کے مقصد میں لکھ دی گئی ہے۔“

”اگر آپ عیال کی بقاء و برداشت کر سکتے ہیں تو آتالیق کو قید میں ڈال دیں۔“

سن تاش نے اپنے باپ کے کان کے ساتھ منہ لگا کر کہا اور وہ باہر نکل گئی۔

”قادر خان! ابو منصور نے کہا۔ میں نے آپ کے ساتھ دوستی کا اور نہیں کبھی استعمال کرنے کا سہارہ کیا ہے آپ کی اطاعت قبول نہیں کی۔ مجھے اتنا کمزور نہ سمجھیں کہ میں آپ کے حکم کا پابند ہو جاؤں۔“

”معلوم ہوتا ہے آپ سلطان محمد سے دُشمن ہیں۔“ قادر خان نے کہا۔ ”آپ کو قید نہیں آیا کہ میں اور تو خان خان آپ کے ساتھ ہیں؟“

”سلطان محمد کا نہیں۔“ ابو منصور نے کہا۔ ”میرے دل میں خدا کا کچھ خوف بھی باقی ہے۔ محمد پر بادشاہی کا شہ ادھی اتنا سوار نہیں ہو کہ میں نے جس کے ہاتھوں میں تعلیم و تربیت پائی ہے اُسے قید میں ڈال دوں۔... آپ چلے جائیں اور اس یقین کے ساتھ جائیں کہ میں سلطان محمد کے ساتھ جنگ میں آپ کے ساتھ ہوں۔“

اُس نے آتالیق کو چلے جانے کا اشارہ کیا۔ آتالیق باوقار چال چلا باہر نکل گیا۔

”سلطان محمد کو اُس کے جاسوس کی خبر دیں گے؟“ ابو منصور نے کہا۔

”میں کہ ہم خراسان پر حملہ کریں گے۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ وہ جانتا ہے ہم اُس کے دشمن ہیں۔ اُس نے خراسان کے دفاع کا انتظام کر رکھا ہے۔ آپ گھبراہٹ نہیں۔ تیاری میں زیادہ وقت نہ لگائیں۔“

قادر خان زحمت ہو گیا۔ آتالیق سن تاش کے پاس چلا گیا اور اُس سے بڑھ چا کر یہ کہاں تک درست ہے کہ موسیقار نابینا نہیں تھا۔ سن تاش نے اُسے بتایا کہ وہ اُسے نابینا ہی سمجھتی رہی ہے اور سلطان محمد کو اُس نے پیغام بھیج دیا ہے لیکن موسیقار نے کہا تھا کہ وہ کسی اور کو بھیجے گا۔

”آگے والی تہا ہی کو خدا ہی روک سکتا ہے۔“ آتالیق نے کہا۔

”میں نے یہی پیغام بھیج دیا ہے کہ تہا ہی کو روکو۔ سن تاش نے کہا۔“ اگر ضرورت پڑی تو میں خود غزنی چلی جاؤں گی، خواہ مجھے کیسے ہی سزا بھگتنی پڑے۔“

بزرگ آتالیق نے سن تاش کو جو تعلیم دی تھی وہ نگ دکھا رہی تھی۔ سن تاش بڑا اور بے خوف ہوتی جا رہی تھی۔

وہ جوان آدمی جو ابو منصور کے محل میں جھکا جھکا کر مازا، اُداس اُداس سا نابینا موسیقار بنا ہوا تھا وہ خراسان کے بہادرؤں، چٹانوں اور جنگلوں کو چیرتا جا رہا تھا۔ اس کی گردن تکی ہوئی اور سینہ پھیلا ہوا تھا۔ گھوڑے کو آرام دینے کے لیے وہ اس کی ریتار کم کر دیتا اور بڑی پُرسوز آواز میں گانے گاتا۔ گھوڑا اڑاں چلا جا رہا تھا جیسے اُس کی آواز سے سور ہو کر چلا جا رہا ہو۔ اُسے اب پڑے جانے کا خطرہ نہیں تھا۔ وہ غزنی کی سلطنت میں داخل ہو چکا تھا۔ غزنی اُچی دور تھا۔

اُس نے چوکیں پر دو گھوڑے بدلے اور خود آرام نہ کیا۔ اسے وقت کا بھی احساس نہ تھا۔ دن تھا رات، وہ چلتا گیا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ کون سے دن کا سورج غروب ہو رہا تھا جب اُسے غزنی کی سبیلوں کے کنارے دکھائی دینے لگے۔

اور وہ جب اپنے سالار کے پاس پہنچا اُس وقت رات تاریک ہو چکی تھی۔ اُس

نے سالار کو بتایا کہ وہ کیا خبر لایا ہے۔ سلطان محمود نے حکم دے رکھا تھا کہ باہر سے کوئی جاسوس خزانہ آتے۔ رات کو واپس آئے، اُسے اُسی دقت جگایا جائے۔ موسیقار کو جس کا نام ابلی ظفر تھا، دیکھتے ہی اُداس کی محقر سی بات سن کر سالار اُسے سلطان محمود کے پاس لے گیا۔ ابلی ظفر نے پہلے تو یہ بتایا کہ وہ نابینا موسیقار بن کر ابو منصور اور سلطان خان کے محل میں دیباری حیثیت پر رہا ہے۔ اس طرح اُسے ابو منصور کے دربار کے علاوہ اُس کے گھر تک بھی رسائی حاصل رہی ہے۔

اُس نے سلطان محمود کو پوری رپورٹ دی کہ کاشغیر کا قادر خان اور بلخ کا تورغان خان ابو منصور کی فوج کو ساتھ ملا کر خراسان پر حملے کی تیاری کر رہے ہیں اور سلطان کے قتل کا منصوبہ بھی بن چکا ہے۔

”ابو منصور اور سلطان خان غزنی کے ساتھ خاندانی دشمنی ختم کرنا چاہتا ہے۔“ ابلی ظفر نے سلطان کو بتایا۔ ”لیکن قادر خان اور تورغان خان نے اُسے اسنا خائف کر دیا ہے کہ وہ اُن کا ساتھ دینے پر مجبور ہے۔ اگر آپ اُسے فوجی تحفظ دیتا کر دیں تو وہ شاید اُن دونوں کے عداوت سے الگ ہو جائے گا۔“

”اُس کے سالاروں کے متعلق کچھ بتا سکتے ہو؟“ سلطان محمود نے پوچھا۔

”سالار ترکستان اور تورقوں کے طلسم میں گرفتار ہیں۔“ ابلی ظفر نے بتایا۔ قادر خان نے انہیں بڑا ہی حسین اور جوان عورتوں کے حال میں بھانپ لکھا ہے۔ وہ ابو منصور کو کہیں ایک شونہ بیٹے پہلے جا رہے ہیں کہ سلطان محمود بریز اور دیکھ گیا کہ وہ چھوٹی چھوٹی اندوہ اور بیاسیوں کو لے کر آئے گا۔ وہ جیسے ہیں کہ سلطان محمود ہندوستان سے تو ناراج بن کر آیا ہے لیکن ان فتوحات نے اُسے ادھی کاٹ سے بہت کمزور کر دیا ہے، اس نے چپکے سے بہت جلدی فیسان پر حملہ کر کے ایک مضبوط مستقر بنالیا جائے اور وہاں سے جھوٹے ہمانے کے حملے جاری رکھے جائیں۔“

”ابو منصور کی فوجی طاقت میں کچھ اضافہ ہوا ہے یا ایک خان کے دقت جتنی تعداد ہے؟“

”سلطان غزنی؟“ ابلی ظفر نے جواب دیا۔ ”ابو منصور نے اس نفی کی کمی پوری

کر لی ہے جو ایک خان نے پہلی فوج کے ہاتھوں مردالی تھی.... میں ابو منصور کی بیٹی سمن تاش کا ذکر ضرور ہی بھتا ہوں۔ وہ اُس کا بزرگ اماں اُداس کی ماں آپ کی پرستار ہیں۔ ماں بیٹی ابو منصور کو مجبور کر رہی ہیں کہ وہ آپ کے خلاف میدان میں نہ آئے.... سمن تاش بڑی خوبصورت لڑکی ہے۔ میں نے اس کی زبان سے یہ الفاظ سنے ہیں کہ میں سلطان محمود کی لونڈی بن کر اس کے پاس رہنے کو تیار ہوں۔“

”کیا اس لڑکی کی شادی ہو چکی ہے؟“ سلطان محمود نے پوچھا۔

”نہیں۔“ ابلی ظفر نے جواب دیا اور سمن تاش نے اُسے جو پیغام دیا تھا وہ اُس نے سلطان محمود کو سنا دیا۔ سلطان محمود گہری سوتج میں گھس گیا۔

سلطان محمود نے ابلی ظفر کو انعام و اکرام دے کر فارغ کر دیا اور اُسی وقت اپنے ایک جوان بیٹے مسعود کو بلایا اور اُسے کہا کہ اُسے ابو منصور اور سلطان خان کے پاس جانا ہو گا اور اُسے فاک کرنا ہو گا کہ وہ غزنی کے خلاف ہتھیار نہ اٹھائے ورنہ وہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔ اُسے یقین دلانا ہے کہ اگر وہ دوستی کا معاہدہ کرتا ہے تو اُسے سلطنت غزنی کی طرف سے فوجی تحفظ ملے گا۔ سلطان محمود نے مسعود کو کہت ہی ہدایات دیں اور اسے تنہا کر اس کے ساتھ کون کون جا رہے۔

مسعود دوسرے ہی دن روانہ ہو گیا۔ اُس کے ساتھ دو شیر تھے۔ دونوں فوجی تھے اور میں گھوڑ سواروں کا محافظ دس بھی اُس کے ساتھ تھا۔ بارہ ترہ دونوں کی مسافت تھی۔ مسعود کے ساتھ تھوڑے اور سامان کے لیے اونٹوں کا پورا قافلہ تھا۔ ابو منصور کی امارت میں بیچ کر مسعود شہر سے کچھ دو خیر زں ہوا اور اُن نے ابو منصور کے ہاں اپنا ایک ایلی اس پیغام کے ساتھ بھیجا کہ سلطان محمود کا بیٹا مسعود آپ سے ملنے اور کچھ ضروری امور طے کرنے آیا ہے۔

ابو منصور دوسرے دن شانہ شانہ شوکت سے مسعود کے پاس آیا۔ تحائف کا تبادلہ ہوا اور مسعود نے اُسے سلطان محمود کا پیغام دیا۔

”میں آپ کے باپ کی تعریف کرتا ہوں کہ اُس کے بھروسہ پر ہتھیار میں۔“ ابو منصور

نے کہا۔ ”اُس کے اندھے بھی دیکھ سکتے ہیں۔“

”اگر کوئی بہرہ ہمارے ساتھ دوستی کر لے تو وہ سننے کے قابل ہو جاتا ہے۔“
مسعود نے طنز کیا۔ ”ابو منصور بہرہ تھا اور بہت اچھی آواز میں اُس کے کان میں بولتے تھے تو وہ سنتا تھا۔“

”شہزادے! ابو منصور نے بولنا سنتے ہوئے کہا۔ تمہیں باپ نے تیغ زنی سکھا دی ہے، زبان کا استعمال نہیں سکھایا میں اُس اندھے کی بات کر رہا ہوں جو اٹھتا نہیں تھا لیکن میرے مبارک میں بڑی کامیابی سے نابینا موسیقار بندھا۔ اسی نے تمہارے باپ کو خبر دی ہے کہ ہم سلطنتِ غزنی کے خلاف لڑنے کی تیاری کر رہے ہیں، اس لیے تم دوستی کا پیغام لے کر آئے ہو۔“

”محترم! مسعود نے کہا۔ میں پیغام لے کر آیا ہوں درخواست نہیں... اور میں کچھ نہیں سکا کہ آپ کون سے نابینا موسیقار کی بات کر رہے ہیں جو ہمارا بھرتہ تھا۔ میں آپ کے ساتھ سیدھی سی بات کرنے آیا ہوں کہ آپ اگر اپنی امارت کو زندہ و طاقت رکھنا چاہتے ہیں تو قادرِ خان اور توانِ خان کی دوستی ترک کر دیں۔ آپ تینوں کی فوج چھ سو ہتھیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اپنے بڑے بھائی ایک خان کا انجام آپ کو یاد ہو گا۔“

”کیا آپ انہیں دھمکیاں دیتے آئے ہیں؟ ابو منصور کے ساتھ آئے ہوئے ایک سالار نے کہا۔ کیا آپ ہمیں اس قدر کمزور سمجھتے ہیں کہ ہم مرعوب ہو کر آپ کی اطاعت قبول کر لیں گے؟“

ابو منصور نے بکھیرا ہوا، اس لیے وہ اپنے سالار کی بات نہ سن سکا۔ مسعود نے سالار سے بات کی تو ابو منصور وہ بھی نہ سن سکا۔ وہ دونوں کوباری باری دیکھتا اور ہنستا تھا کہ یہ آپس میں کیا باتیں کر رہے ہیں۔

”کچھ مجھے بھی بتاؤ۔“ ابو منصور نے اپنے سالار سے کہا۔ تم لوگ کیا بات کر رہے ہو؟“

”یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ کا شہر اور بلخ و بلوں کی دوستی سے باز نہ آئے تو ہم آپ

پر حملہ کر کے آپ کو تباہ و برباد کر دیں گے۔“

ابو منصور نے مسود کو فضلی نکاحوں سے دیکھا اور کہا۔ ”دیکھو شہزادے! اگر تم ہمیں دھمکی دے کر ہمارے ساتھ وہی کرنے آئے ہو تو واپس چلے جاؤ اور اپنی فوج کے ساتھ آنا۔“

مسعود نے ابو منصور کے کان میں بلند آواز سے کہا۔ ”اگر حکمران بہرہ اور سالار جھپٹا ہو تو ملک اور رہا ہوا کا خدا ہی حافظ ہے۔ محترم! آپ کا سالار جھوٹ بول رہا ہے۔ میں نے کچھ اور کہا تھا۔ اگر سالار حکومت کے کاروبار میں اسی طرح دخل اندازی کرنے لگیں تو حکومت زیادہ دیر نہیں چل سکتی۔“

کچھ دیر بحث مباحثہ ہوتا رہا۔ مسعود نے ابو منصور کو اس حد تک قائل کر لیا کہ اُس نے کہا۔ ”آپ چند دن یہاں رہیں۔ ہم سوچ کر جواب دیں گے۔ اتنے دن آپ شکار کھیل سکتے ہیں۔ آپ کے آرام کا، کھانے اور دل بہلانے کا پورا انتظام کیا جائے گا۔“

محل کے باورچی اور ملازم لگے اور انہوں نے مسعود اور اس کے تمام آدمیوں کے کھانے وغیرہ کا انتظام سنبھال لیا۔ ایک روز مسعود خیمہ گاہ سے زرا بہت کر اکیلا ہی نکل رہا تھا کہ محل کا ایک ملازم جو خیمہ گاہ کے انتظام کے لیے آیا تھا، مسعود کے قریب آیا اور رازداری سے کہا۔ ”محل شکار کے لیے جا رہا ہے۔ ابو منصور سلطان محل کی مٹی سن تاش آپ کو جنگل میں لے گی۔“

”مجھے جنگل میں قتل کیا جائے گا یا خیمے میں؟“ مسعود نے پوچھا۔

”آپ کے محافظ آپ کے ساتھ ہوں گے۔“ ملازم نے کہا۔ ”آپ کو قتل نہیں کیا جائے گا۔“

ابلی ظفر نے سلطان محمود کو بتایا تھا کہ سن تاش اپنے باپ کے خلاف ہے۔ سلطان محمود نے مسعود کے ساتھ سن تاش کا ذکر دیے ہی کیا تھا۔ ایک شہزادی کا اپنے باپ کے خلاف ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ امارت کی فوج پر ایک شہزادی کا حکم

”اور مگر ایک بھائی تخت تاج کی طس سے اپنے بھائی کا خون بہانے کے لیے تیار ہو جائے تو اُس کے متعلق شمار کیا خیال ہے؟“
”اُسے جیسے لاکوئی تھی نہیں۔“ سمن تاش نے کہا۔ ”اُس کے خلاف جہاد فرض ہو جاتا ہے۔“

”ان میں ایک تو تارا باب ہے۔“ مسعود نے کہا۔ ”میرا یہاں آنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ان کے خلاف جہاد فرض ہو جائے تاکہ نوبت نہ آئے۔ کیا تم اپنے باپ کو اس اصول کا پابند نہیں کر سکتیں جس کی تم قائل ہو؟“
”نہیں۔“ سمن تاش نے کہا۔ ”میں نے آپ کو یہی بتانے کے لیے بلایا ہے کہ میرا باپ اپنی ایمان فردشوں میں سے ہے جن کے خلاف جہاد فرض ہے۔ آپ شاید حیران ہوں گے کہ کوئی بیٹی۔ اپنے باپ کے خلاف ہو سکتی ہے لیکن میں جس جذبے کے تحت اپنے باپ کے خلاف ہوں اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں آپ سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ بیشتر اس کے کافر دغا خان اور دغا خان کی فوجیں یہاں آجائیں اور ہماری فوج کے ساتھ مل کر ایک طاقتور فوج بن جائیں، آپ ہمارے شہر کو محاصرے میں لے کر اس پر قبضہ کر لیں۔ اس سے یہ ہو گا کہ خون خرابہ کم ہو گا۔ ہماری فوج آپ کی فوج کے مقابلے میں بہت کمزور ہے۔ اگر آپ کا مقصد تین فوجوں سے ہوا تو دونوں طرف ایک ہی قوم کا اتنا ہی خون بہہ جائے گا جتنا پہلی فوجوں میں بہہ چکا ہے۔“

”سلطان جو ہندوستان پر بڑھ چڑھ کر چلے کر رہے ہیں، ایسا کبھی نہیں کریں گے کہ کسی مسلمان امارت یا ریاست پر چڑھ دوں۔“ مسعود نے کہا۔ ”ہمارا مقصد قبضہ کرنا نہیں، عالم اسلام کو کفر کے خلاف ایک عسکری قوت بنانا ہے۔ اگر ہمیں آپ کی امارت پر قبضہ کرنا ہوتا تو سلطان مجھے دوستی کا پیغام دے کر نہ بھیجتے۔“
”میرے ابا دوستی نہیں کریں گے۔“ سمن تاش نے کہا۔ ”انہوں نے آپ کو دوستی کرنے کے لیے کہا ہے لیکن وہ ان سالاروں اور مشیروں کے قبضے میں ہیں، جو قادر خان کے ہی دلکش جال میں آئے ہوئے ہیں۔ وہ کانٹوں سے بہرے ہیں۔“

”نہیں چل سکتا تھا۔ مسعود نے سمن تاش کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ اب ایک ملازم نے اُسے کہا کہ شہزادی سمن تاش اُسے جنگل میں ملے گی تو اُس نے اسے دھوکہ نہ سمجھا۔“

دوسرے دن وہ شکار کو چلا گیا۔ وہ اپنے مشیروں کو ساتھ نہ لے گیا۔ بازو چھ محافظوں کو اُس نے اس طرح ساتھ لیا کہ انہیں اپنے ارد گرد پھیلا دیا کہ کسی طرف سے بھی کوئی اس پر قاتلانہ حملہ نہ کر سکے۔ وہ گھوڑے پر سوار کمان میں بیٹھا اور ادھر ادھر دیکھتا جنگل میں بڑھتا گیا۔ جنگل گھنا ہوتا گیا اور سہری بھری سہرہ بن جائیں بھی آگئیں۔ اُسے اپنے محافظوں کے گھوڑوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔
ایک جگہ تو بہت ہی خوشنما تھی۔ چوڑے پتوں والی سلیس گھم گھم ہو کر درختوں کے ساتھ لپٹی ہوئی تھیں۔ مسعود کو دہاں ایک جوان لڑکی کھڑی نظر آئی۔ اُس کے قریب ایک گھوڑا کھڑا تھا اور لڑکی کے کندھے کے ساتھ کمان تک رہی تھی۔
ترکش گھوڑے کی زین کے ساتھ بندھی تھی۔ لڑکی کا چہرہ جس قدر دلنشین تھا اتنا ہی عجیبہ تھا۔ وہ چپ چاپ کھڑی تھی۔ اُس کا یہ انداز بڑا سراسر سا لگتا تھا۔ مسعود نے پندرہ بیس قدم دُور گھوڑا روک لیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔
”اگر آپ مسود بن محمد ہیں تو گھوڑے سے اتر کر آگے آجائیں۔“ لڑکی نے کہا۔
”آپ کے بے بیان کوئی منظرہ نہیں۔ میں سمن تاش ہوں۔“
مسعود گھوڑے سے اتر کر اُس کے قریب چلا گیا۔ سمن تاش نے اُسے گھاس پر بٹھایا۔

”مجھے ایک جوان لڑکی کے بلانے پر یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔“ مسعود نے کہا۔ ”لیکن مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ سلطان غزنی کی حامی ہیں۔“
”آپ کو غلط بتایا گیا ہے۔“ سمن تاش نے کہا۔ ”میں سلطان غزنی کی نہیں سلطان دو جہاں کی پرستار ہوں۔ میں اُس رسول کی غلام ہوں جو سلطان غزنی کا بھی رسول ہے۔ میں اس اصول کی حامی ہوں کہ ایک رسول کا کلمہ پڑھنے والوں کو ایک دوسرے کا خون نہیں بہانا چاہیے۔“

”یہ کس کا انتظام ہے؟“

”خان کا شوہر قادر خان کا۔“ زخمی نے کہا۔ ”اور اُس نے آپ کے والد امیر محترم ابو منصور ارسلان خان سے بات کر لی تھی۔“

”انہوں نے کیا کہا تھا؟“ سمن تاش نے پوچھا۔

”آپ کے والد محترم نے کہا تھا کہ میں نے سلطان محمود کے بیٹے کو اپنے جواب کے انتظار کے لیے روک لیا ہے۔ تم لوگ اپنا کام کر سکتے ہو۔ وہ شکار کے لیے جہز دے گا۔ اسے ایک دو ایسے ملازم دو جو تیس قبل از وقت بتا سکیں کہ وہ شکار پر جا رہا ہے۔“

”اے گھوڑے پر ڈالو اور لے چلو“ سمن تاش نے مسود کے ایک محافظ سے کہا اور مسود سے کہا ”میں نے آپ کو یہی بات بتانے کے لیے یہاں بلایا تھا کہ آپ یہاں انتظار نہ کریں اور اپنی حفاظت کا انتظام بڑا سخت رکھیں۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ میں نے چنان پر بودوں کی ادب میں اس آدمی کو ہٹا جلتا دیکھ لیا تھا۔ مجھے اس کی کمان بھی تھوڑی سی نظر آگئی تھی۔ اس جگہ شاہی خاندان کے سوا کوئی بھی شکار کے لیے نہیں آ سکتا۔ میں نے سیلوں کے پیچھے چھپ کر اس پر تیر چلایا تھا۔“

”مجھے کیا کرنا چاہیے؟“ مسود نے پوچھا۔

”آپ واپس چلے جائیں۔“ سمن تاش نے کہا۔ ”مجھے نظر آ رہا ہے کہ ہماری ملاقات میدان جنگ میں ہوگی؟“

”کیا تم مجھے میدان جنگ میں لوگی؟“

”شاید“ سمن تاش نے کہا اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”آنسو کیوں؟“

”میں پاگل ہوں“ سمن تاش نے جذباتی سے لہجے میں کہا۔ ”ذرا سی خاموشی کے بعد اُس نے مسود کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اور جھنجھلا کر کہا۔ ”کیا میں پاگل نہیں ہوں مسود؟ کیا میرا تعلق پاگل ہے؟ قریب کاروں کی ہستی میں جو بات کہنے والوں کو پاگل کہا کرتے ہیں۔ میری شادی ایک ایسے شہزادے کے

وہ وہی بات سن سکتے ہیں جو اُن کے کان میں بھی جائے۔“

سمن تاش چپ ہو گئی۔ اُس نے آنکھیں سیکڑ کر ایک طرف دیکھا جیسے کسی شہزادی کو گھنی جھاڑیوں میں کسی شکار کی حرکت نظر آ رہی ہو۔ اس کے ساتھ ہی ہنس

نے مسود کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور درخت کے پیچھے کر دیا۔ وہاں بیلیں دیو لوروں کی طرح درختوں پر چڑھی ہوئی اٹھتیں۔ سمن تاش نے مسود سے کہا۔ ”یہاں سے ہٹنا نہیں۔ ابھر اُدھر دیکھتے رہنا۔ اور وہ خود بیلیوں میں غائب ہو گئی۔ مسود حیران و پریشان وہاں کھڑا رہا۔ وہ کسی پھندے میں آ رہا تھا یا تھوڑی دیر بعد اپنے قریب ہی اُسے کمان میں سے تیر نکھنے کی آواز سنانا دی۔ یہ چونکا۔

فوجیوں کے کسی کی کرناک آہ سنانا دی۔ مسود نے منہ سے سیٹی بجائی اُس کے تین چار محافظ جو سیٹی سن کے آواز میں سوئے اُس کے پاس آ گئے۔ اُس نے سامنے والی سرسبز چٹان پر ایک آدمی کو کھڑے دیکھا جس کے کندھے میں تیر اتر اُٹھا ہوا تھا۔ اُنہوں نے سامنے آ کر مسود سے کہا۔ ”میرے ساتھ آؤ۔“

مسود اپنے محافظوں کے ساتھ اُس چٹان پر گیا جہاں اُس نے وہ آدمی دیکھا تھا جس کے کندھے میں تیر اتر اُٹھا تھا۔ وہ آدمی بیٹھ گیا تھا اور گراہ رہا تھا۔ سمن تاش نے خبر نکال کر اس کی نوک اُس زخمی کی شہ رگ پر رکھ دی۔

”برج بتا دو تو نہیں گھوڑے پر اٹھ لے جاؤ گی اور یہ تیر نکلو اگر زخم کا علاج کرادوں گی۔“ سمن تاش نے اُسے کہا۔ ”تھوٹ بولو گے تو درخت کے راتھ بانہ جاؤ گی۔ سوچو کہ تم کسی موت مرو گے۔“

زخمی نے ہم طلب نگاہوں سے پہلے سمن تاش کو پھر مسود کو دیکھا اور بولا۔ ”سلطان محمود کے بیٹے کو قتل کرنے آیا تھا۔“

”تمہیں کس نے بتایا تھا کہ سلطان محمود کا بیٹا یہی ہے؟“ سمن تاش نے

پوچھا۔

”مجھے دکھایا گیا تھا۔“ زخمی نے کہا۔ ”میرے ساتھ ایک اور آدمی تھا۔ وہ بھاگ گیا ہے۔“

ساتھ ہوگی جو شراب پیتا ہے اور جسے احساس ہی نہیں کہ قوم اور مذہب کی کیسا ذمہ داریاں ہیں جو اُس پر عائد ہوتی ہیں۔ اُس کے ایک ہاتھ میں کمان تھی اور دوسرے ہاتھ میں خنجر۔ اُس نے دونوں ہتھیلے آگے کر کے بوجوش آداریں کہا۔ میری شادی ان سے ہو چکی ہے۔ یہ میرے سہاک کی دونشیاں ہیں۔ کمان اور خنجر۔ عورت مرد کی تفریق اور نمائش کی چیز نہیں۔ کمان اور خنجر عورت کا زیور ہے۔ تم ایسی باتیں کیوں کر رہی ہو؟ مسعود نے کہا جس کے ہاتھ میں کمان اور کندھے کے ساتھ ترکش لٹک رہی ہو، اُس کی آنکھوں میں آنسو نہیں کیا کرتے۔۔۔ سن اکیا میں نہیں کھڑے رہنا چاہیے؟

”نہیں“ سن تاش نے کہا۔ آپ چلے جائیں آپ غزنی چلے جائیں۔ آپ کو اُس جاسوس نے جو یہاں نابینا موسیقار بن کے آیا تھا، بہت کچھ بتایا ہو گا۔ اُس نے آپ کے والد محترم تک میرا پیغام پہنچا دیا ہو گا۔“

”یہ تم اُس سے پوچھ لو“ مسعود نے اپنے ایک محافظ سے کہا۔ ”ابلی ظفر کو بلا دو۔“ ایک گھوڑا سوار گھوڑا اڑاتا چٹان پر اُگیا۔ وہ بھرے بھرے چہرے والا تو مزہ جو ان تھا۔ وہ گھوڑے سے اتر کر مسعود تک گیا تو اُس کی جال سے بیٹھے چٹان ہل رہی تھی۔

”اُم نہیں بچانے ہو ظفر؟“ مسعود نے سن تاش کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ ابلی ظفر سن تاش کو دیکھ کر سسکرایا۔ سن تاش بھی سسکرا دی۔

”میں نے تمہیں مشکل سے بچا ہے۔“ سن تاش نے اُسے کہا۔ ”اپنے سلطان کا میرا پیغام پہنچا دیا تھا؟“

”لفظ بہ لفظ۔“ ابلی ظفر نے جواب دیا۔

”یہ ہمارا بڑا ہی کامیاب جاسوس ہے۔“ مسعود نے کہا۔ ”یہ محافظ دے سے گا آدمی نہیں۔ اسے میں اپنی رہنمائی کے لیے ساتھ لایا ہوں اور سن اُس زخمی کو کہاں لے گئے ہیں؟“

”میں فیصلہ نہیں کر سکی کہ اسے اپنے باپ کے پاس لے جاؤں یا جراح کے

پاس۔“ سن تاش نے جواب دیا۔ ”میں جا رہی ہوں۔ معلوم نہیں کہاں ملاقات ہوگی۔ ہوگی یا نہیں۔ آپ کو دوستی کے پیغام کا جواب مل گیا ہے۔ آپ آج ہی روانہ ہو جائیں۔“

سن تاش ہرن کی طرح کودتی پھلانگی چٹان سے اتر گئی۔ مسعود اُسے دیکھتا رہا۔ وہ گھوڑے پر سوار ہوئی اور شہسوار کی طرح اتر لگا کر جنگل میں غائب ہو گئی۔ جب تک اُس کے گھوڑے کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی رہی مسعود اُڑھ رہی دیکھتا رہا۔

”آپ سمجھ نہیں سکتے کہ یہ لڑکی کتنی ہی احمق کے مشعلی کس قدر جذباتی ہے۔“ ابلی ظفر نے کہا۔ ”میں نے اس کے ساتھ بہت وقت گزارا ہے۔ اسے جتنا میں جانتا ہوں اتنا کما نہیں جانتا۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ لڑکی غزنی کی سلطنت کے لیے بہت بڑی قربانی دے گی۔“

مسعود کی ذہنی کیفیت بدل گئی۔ اُس نے اپنے محافظوں سے کہا۔ ”میرے ساتھ چلو۔“ اور وہ چٹان سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہوا۔ اُس کے تمام محافظ اُس کے پاس آگئے تو اس نے شہر کا رخ کر لیا۔ اُس نے گھوڑے کو اتر لگا دی۔ تیر کے زخمی کو جس گھوڑے پر لے جایا جا رہا تھا وہ ابھی شہر میں داخل ہی ہوا تھا۔ سن تاش کا گھوڑا اس سے آگے نکل گیا تھا۔ زخمی کا خون بہہ رہا تھا۔ مسعود نے حکم دیا کہ اس زخمی کو محل میں لے چلو۔

ابو منصور ارسلان خاں اپنے دربار میں بیٹھا تھا۔ مسعود بن محمود اطلاق دیتے بغیر اندر چلا گیا۔ اُس کے پیچھے پیچھے مسعود کا ایک محافظ اندر داخل ہوا۔ اُس نے کندھے پر ایک زخمی کو اٹھا رکھا تھا جس کے کندھے میں ایک تیر اتر رہا تھا۔ مسعود کے اشارے پر محافظ نے زخمی کو فرش پر لٹا دیا۔ زخمی کا خون بہہ رہا تھا۔

”یہ کیا ہے مسعود بن محمود؟“ ابو منصور نے پوچھا۔

”یہ آپ کا وہ جواب ہے جو آپ نے میرے دوستی کے پیغام کا دیا ہے۔“ مسعود نے کہا۔ ”میں آپ کا شکر یہ ادا کر لے آیا ہوں کہ آپ نے مجھے زیادہ دن

تھی۔ اس کے پاس ہاتھی تھے جو اس کے دشمنوں کے پاس نہیں تھے۔ اس کے علاوہ سلطان کے پاس تقریباً چار سو گھوڑے تھے جو اس نے ہندوستان کی شکست خوردہ فوجوں سے حاصل کئے تھے۔ وہ ان کے استعمال کا قائل نہ تھا لیکن قبائلیوں سے لڑنے کے لیے اُس نے رتھوں کا استعمال ضروری سمجھا۔

یہ جی قسم کے رتھ تھے۔ ہر رتھ کے آگے ایک گھوڑا جوتا جاتا اور اس میں دو آدمی ہوتے تھے۔ دونوں رتھ کے ہوتے تھے۔ ایک گھوڑے کو بھگاتا اور دوسرے کے پاس پھینکنے والے برچھیاں اور تیردھماکے ہوتے تھے سلطان محمود نے رتھوں کے دو دستے تیار کر رکھے تھے اور اب اُس نے دونوں دستوں کو بلخ پہنچنے کا حکم دے دیا تھا۔

موزخوں اور اُس دور کے جنگی مہتمموں نے لکھا ہے کہ سلطان محمود کی فوج ٹریننگ اور میدان جنگ میں دلہن اور دستوں کے باہمی ملاپ کے لحاظ سے ایک عمدہ فوج تھی۔ نہایت دشوار صورت حال میں بھی دستوں میں بھگدڑ اور انتشار پیدا نہیں ہوتا تھا۔ البتہ اس معرکہ میں سلطان کو اپنی یہ کمزوری پریشان کر رہی تھی کہ اُس کی فوج کی تقریباً نصف نفری ہندوستان میں شہید ہو گئی تھی۔ اس کی کمی جتنک اُس نے اُن ہندو دستوں سے پوری کر لی تھی جنہیں وہ جنگی قیدی بنا کر لاتا رہا تھا۔ ان ہندوؤں کو اُس نے اپنی فوج کی بجائے بہتر اور زیادہ مراعات دے رکھی تھیں۔ ان میں سے ہندو اکثر اسلام قبول کرتے رہتے تھے۔ ان دستوں کو وہ ہندوستان نہیں لے جاتا تھا۔

جب سلطان محمود بلخ پہنچا تو اُس نے آرام کئے بغیر دستوں کی تقسیم کا کام شروع کر دیا مگر اُس سے یہ ضروری کام دیکھنے سے نہ ہوسکا کیونکہ اُسے اطلاع ملی کہ دشمن تبریز کے مقام پر دریا سے اوکسوس پار کر رہا ہے۔ یہ مقام بلخ سے تقریباً پچاس میل دُور تھا۔ سلطان محمود کو سالاروں نے مشورہ دیا کہ دریا پار کرنے کے دوران ہی حملہ کر دیا جائے لیکن سلطان نے کہا کہ انہیں اطمینان سے گزر

قبائل کو ملے بغیر کالابرج دے کر اور اسلام کے خلاف نفرت پھیلانے کے ساتھ ملتا چلا آ رہا ہے۔ یہ قبائل وحشی، خونخوار اور جنگجو ہیں۔ ان کا اپنا ہی بنایا ہوا کوئی مذہب ہے۔

”مجھے معلوم ہے“ سلطان محمود نے کہا۔ ”اسی لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں انہیں بلخ سے کچھ دُور میدانی علاقے میں لاکر لڑاؤں گا۔ ان قبائل سے میں واقف ہوں۔ وہ جنگجو اس لیے ہیں کہ آپس میں لڑتے رہتے ہیں اور وہ صرف پہاڑیوں میں لڑ سکتے ہیں۔ ان کے گھوڑے بھی سنگلاخ وادیوں میں بھاگ گئے دُور نے کے مادی ہیں۔“

غزنی سے بلخ تک کا فاصلہ بھی خاصا زیادہ تھا۔ سلطان محمود نے اب ظفر (نامینا موسیقار) کی اطلاع پر پہلے ہی خراسان کی فوج کو بلخ سے کچھ دُور جمع ہو کر تیاری کی حالت میں رہنے کا حکم بھیج دیا تھا۔ دہاں ہاتھیوں کی تعداد گھوڑوں کی تھی۔ سلطان محمود نے غزنی سے تین سو ہاتھی اس حکم سے بلخ کو روانہ کر دیئے کہ بہت تیز رفتار سے جاتیں۔

صرف دو موزخوں نے اس جنگ کا ذکر کیا ہے۔ ان میں ایک غلبی ہے اور دوسرا ابن الاثیر۔ انہوں نے لکھا ہے کہ اس لڑائی میں سلطان محمود اپنی جنگی طاقت کی نمائش پر زیادہ توجہ دے رہا تھا تا کہ اس کے دشمن اور پہاڑی قبائل مرعوب ہو جائیں اور آئندہ سرائی کھانے کی جرأت نہ کریں۔

قادر خان، توغان خان اور ابو منصور کی فوجیں ایک دوسری کے پیچھے تیزی سے چلی آ رہی تھیں۔ ان کے لیے رسد کی کمی نہیں تھی۔ پہاڑی قبائل ان کی بہت مدد کرتے تھے۔ دونوں مورخ لکھتے ہیں کہ یہ قبائل سرپٹ دُور تے گھوڑوں سے تیرا اندازی کے ماہر تھے اور لڑائی میں بھی بھاگتے دُور تے لڑا کرتے تھے۔ سلطان محمود کے دشمنوں کو ان کی اسی مہارت اور لڑنے کے انداز پر نماز تھا۔ تینوں فوجوں کی اپنی نفری بھی بہت تھی۔ موزخوں کے اندازے کے مطابق سلطان محمود کی فوج بھی اتنی ہی

آنے دو۔ اس کے بعد دریا ہمارا دوست ہو گا۔ سلطان محمود کو اس اطلاع سے یہ اطمینان ہوا کہ دشمن کا رنج کچھ کی طرف ہے۔

سلطان محمود نے ہاتھوں کو دھتور میں تقسیم کر کے ایک حصے کو بلخ سے پانچ چھ میل دُور دائیں اور دوسرے حصے کو اتنی ہی دُور بائیں جا کر دریا کی طرف چلے جانے کو کہا۔ ان کے ساتھ اُس نے ایک ایک سو رتھ اور ایک ایک دستہ پیادوں کا بھیج دیا۔ انہیں سلطان کے حکم کا انتظار کرنا تھا اور ان کے لیے اہم حکم یہ تھا کہ وہ دشمن کو نظر نہ آئیں۔

چوتھے روز دشمن کا ہراول نظر آیا۔ سلطان محمود کو اطلاع ملی تو وہ اٹھا اور قبلہ رو ہو گیا۔ اُس نے دو لعل ادا کئے اور دھماکے بعد پہلا حکم دیا کہ دشمن کے ہراول پر ایک بھی تیر نہ چلے۔ وہ حکم دے ہی رہا تھا کہ اُسے اطلاع ملی کہ دشمن کا ایک جاسوس پکڑ لائے ہیں۔ اس کے حکم پر جاسوس کو اس کے سامنے لایا گیا۔

”اے سلطان!“ جاسوس نے کہا۔ ”میں بلا ساغون کا جاسوس ہوں لیکن میں ایک خبر دیتے آیا ہوں کچھ معلوم کرنے نہیں آیا۔“

”کیا خبر ہے؟“ سلطان محمود نے پوچھا۔

”جو کچھ بھی ہے وہ آپ کے فرزند مسعود کے لیے ہے۔“ جاسوس نے کہا۔

”آپ انہیں ذرا جلدی دلائیں۔“

مسعود کو بلا لیا تو جاسوس نے سلطان محمود کی موجودگی میں بتایا کہ اُسے ابو منصور کی بیٹی سن، نے اپنے اس زبانی پیغام کے ساتھ بھیجا ہے۔ میں نے تمہیں کہا تھا کہ میدان جنگ میں ملاقات ہوگی۔ میں اُن مستورات کے ساتھ آگئی ہوں جو میرے آبا اور اس کے سالاروں وغیرہ کی بیویاں اور داشتائیں ہیں۔ ہماری فوجوں کی ترتیب یہ ہے کہ ہماری فوج دائیں پہلو پر ہے۔ ہماری فوج بائیں پہلو پر ہر در درمیان میں تھوڑے خان کی فوج ہے۔ تباہیوں کو تینوں فوجوں کے ساتھ تقسیم کر دیا گیا ہے۔ میرے آبا اپنی فوج کی کمان خود کر رہے ہیں۔ آپ کے والد بہتر سمجھتے ہیں

کہ وہ ہماری ترقیب جان کر اپنی فوج کی تقسیم کس طرح کریں گے۔ میں نہیں مشورہ دوں گی کہ ہماری طرف تم آنا۔ میں کوشش کروں گی کہ تم تک زندہ پہنچ سکوں۔ زندہ نہ رہی تو خدا حافظ!“

جاسوس نے کہا۔ ”آپ مجھے اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔ شہزادی نے کہا تھا کہ واپس نہ آنا۔“

”مسعود!“ سلطان محمود نے جاسوس کو باہر نکال کر مسود سے پوچھا۔

”کیا یہ کوئی جذباتی معاملہ ہے؟ اگر ایسا ہی ہے تو میں تمہیں اس طرف نہیں بھجوں گا۔“

”مسائلہ جذباتی ہے لیکن ذاتی یا سفلی جذبات کا نہیں“ مسعود نے جواب دیا۔

”آپ مجھے اُسی طرف بھیجیں۔ میں اس لڑکی کی بجائے اس کے باپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ آپ اس پیغام کو دھوکہ نہ بھگیں۔ آپ کو اس لڑکی کے ستانی ابلی خضر بھی بتا چکا ہے اور میں نے بھی آپ کو بہت کچھ بتایا ہے۔“

پانچویں صبح کا سورج سرخ رنگ کی گرد میں اس طرح چھپا ہوا تھا کہ چلتے ہوئے گولے کی طرح نظر آتا تھا۔ الیاس بن اسمعیل تحریر سے پڑھتا ہے کہ دونوں ذہین اللہ اکبر کے نعرے لگا رہی تھیں اور ایک دوسرے کے خون کی پینا سی تھیں۔ دشمن اسی ترتیب میں آ رہا تھا جو سن تاش نے بتائی تھی۔ گھوڑسوار قاصدوں کی سرپٹ بھاگ دوڑ شروع ہو چکی تھی۔ اُن کی اطلاعوں سے دشمن کی ترتیب کا پتہ چل رہا تھا۔ سلطان محمود اس کے مطابق قاصدوں کو پیغام دے رہا تھا۔ قادر خان کی فوج درمیان میں اور خامی تیجھے تھی۔ توغان خان اور ابو منصور دائیں اور بائیں دائیں سے چند میل دُور چلے آ رہے تھے۔ یہ گھیرے کی ترتیب تھی۔ وہ بلخ کو اور سلطان محمود کی فوج کو گھیرے میں لینا چاہتے تھے۔

سلطان محمود نے مسود کو اُس طرف بھیج دیا تھا جدھر ابو منصور کی فوج تھی۔ جدھر سے توغان خان کی فوج آ رہی تھی اُدھر سلطان نے ایک اور تجربہ کار سالار بھیج دیا تھا۔ دشمن کی تینوں فوجوں کے درمیان ڈیڑھ ڈیڑھ دو درمیل کا فاصلہ

تھا۔ ان غالی جگہوں میں سلطان محمود کے دستے جا رہے تھے۔ ہاتھی، زکھ اور پہیہ دستے پہلے ہی اُس طرف نکل گئے تھے۔ اس سے سلطان نے دشمن کے لیے یہ صورت پیدا کر دی کہ توغان خان اور ابو منصور کی فوجیں دائیں بائیں سے سلطان کے گھیرے میں آگئیں۔

سلطان محمود نے اپنے سپہ سالاروں کے ساتھ قاصد دوڑا دیے۔ سورج اوپر اٹھ آیا تھا مگر گردنے اس کی بدشئی مدھم کر رکھی تھی۔ اچانک زمین و آسمان کا پھٹنے لگے۔ سلطان محمود نے دشمن کے دائیں اور بائیں پہلوؤں پر حملے کا حکم دے دیا تھا۔ دونوں پہلوؤں پر دونوں اطراف سے حملہ ہوا۔ ایک طرف ہاتھی اور رکھتے تھے۔ قبائلوں نے اپنے مخصوص انداز سے گھوڑے دوڑائے اور زیر اندازی کی کوشش کی لیکن اتنے گھسان کی جنگ میں انہیں اپنے پرانے کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔

قادر خان کو بھی پتہ نہیں چل رہا تھا کہ اس کے دائیں بائیں کیا ہو رہا ہے۔ اُسے پہلوؤں سے کوئی پیغام نہیں مل رہا تھا۔ اُسے بتانے والا کوئی نہ تھا کہ اُس کے پہلو کھلے اور ہاتھیوں تلے مسئلے جا رہے ہیں۔

دائیں طرف ابو منصور کی حالت اچھی نہیں تھی۔ اُس کی فوج پر ایک طرف سے مسعود نے حملہ کیا اور جب اس کی فوج اس طرف متوجہ ہوئی تو پیچھے سے چھانٹتے ہاتھیوں اور تھوڑے سواروں اور سپاہ دستوں نے حملہ کر دیا۔ رکھ سواروں کی توجہ بایکوں پر تھی۔ جو پہلی کوئی قبائلی اپنے گھوڑے کو باہر نکالتا اور اپنے انداز سے لڑنے کی کوشش کرتا، دور رکھ سوار اس کے دائیں بائیں دوڑ پڑتے اور اُسے برہمی یا تیر سے گرا دیتے۔

شام سے کچھ پہلے مسعود ایک بلند جگہ کھڑا اڑان کا منظر دیکھ رہا تھا عقب سے تین گھوڑے سرپٹ دوڑتے آرہے تھے۔ ایک سوار کے ہاتھ میں سفید جھنڈا تھا۔ مسعود کے محافظوں نے گھوڑے اُن کی طرف دوڑا دیے کیونکہ یہ دھوکہ بھی ہو سکتا

تھا۔ وہ تینوں سواروں کو اپنے ساتھ مسعود کے سامنے لے آئے۔ ان میں ایک سوار سن تاش تھی جس کے سر اور چہرے پر موٹا پراٹھا تھا۔ اس کے ساتھ دو مرد گھوڑ سوار تھے۔ سن تاش کو دیکھ کر گھوڑے سے اُتری اور دوڑان مسعود کے پاس آئی۔

”بڑی مشکل سے تمہارا پتہ چلا ہے۔“ وہ ہاتھی بولی سانسوں سے بول رہی تھی۔ ”میرے آبا بھائیوں کی فکر میں ہیں لیکن ان کا ایک سالار انیس قبوئی قبیلانے ملے رہا ہے۔ وہ فوج کا قلب سمجھے لے گئے ہیں۔ انہیں یقین ہو گیا ہے کہ انہیں شکست ہو چکی ہے۔ اُن کے پاس قادر خان کا قاصد یہ پیغام لے کر آیا ہے کہ اُس نے بلخ کی طرف پیش قدمی روک دی ہے اور وہ اپنی فوج کو دائیں اور بائیں کمک کے طور پر تقسیم کر رہا ہے۔ اُس نے کہا کہ حوصلہ نہ مارنا، سلطانی فوج کو ہم گھیرے میں لے رہے ہیں۔۔۔۔ میں نے تمہارا مسلح کس طرح لگا دیا اور یہاں تک کس طرح پہنچی، یہ پتہ کبھی بتاؤں گی۔ میں اس لیے آئی ہوں کہ تمہارے طلب کو تم ذرا سی بہت سے پکڑ سکتے ہو۔ مجھے معلوم نہیں کہ دوسری طرف لڑائی کی صورت حال کیا ہے میں اپنی فوج کی بات کر رہی ہوں۔“

مسعود سوج میں پڑ گیا۔

”کیا سوج میرے حوالے سن تاش نے کہا۔“ میرا گھوڑا لاشوں کو روندتا آیا ہے۔ مرنے والوں میں غزنوی بھی ہیں، ترکستانی اور بخاری بھی مگر ہر کسب ایک جیسے لگتے ہیں۔ وہ مسلمان تھے۔ اُس نے چلا کر کہا۔ ”اپنی قوم کا خون رو کر مسود! میں جو کہتی ہوں وہ محرو۔ قادر خان کی کمک آگئی تو یہ قتل و غارت نہیں دے سکے گی۔ اس سے پہلے ہمارے قلب کو ٹھٹھی میں لے لو۔“

”تم ساتھ چلو گی؟“

”نہیں!“ سن تاش نے کہا۔ ”میں جلدی ہوں۔ تم آؤ۔“

وہ گھوڑے پر سوار ہوئی اور دو ہمانظروں کے ساتھ جو اُس کے زرخیز بننے ہوئے تھے، میدان جنگ کے گرد و غبار میں غائب ہو گئی۔ وہ مسود کو بتاتی تھی کہ اُس

کاباپ کہاں ہے۔

کرناک آوازیں نہیں پہنچ رہی تھیں، نہ دہان تک خون اور لاشوں کی بو پہنچتی تھی۔ وہ اس خوش نہیں میں کبھی مبتلا تھے کہ دہان تک کوئی خطرہ نہیں پہنچ سکتا مگر امان لڑش باپ کی دین دارمیٹھی ایک نہایت بڑا خطرہ بن کر اُس کے ساتھ موجود تھی۔ مسعود نے خیر گاہ میں داخل ہو کر ایک مشعل اٹھائی اور ابو منصور کے پیچھے چلا کر اُسے جگایا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا تو مسعود کو دیکھ کر پوری طرح ہوش میں آگیا۔ باہر مسعود کے آدمیوں نے می فطوں کو جگا کر الگ کھڑا کر لیا اور سالار کو بھی کھڑا کیا تھا۔ ابو منصور نے مسعود سے کہا کہ وہ شکست تسلیم کرتا ہے لیکن اُس کی بیٹی کو گرفتار نہ کیا جائے۔ مسعود نے اس کے ساتھ کوئی بات نہ کی۔

نصف شب کا عمل ہو گا۔ سلطان محمود ابھی ابھی میدان جنگ کا چکر لگا کر آیا تھا۔ اُسے اطلاع دی گئی کہ مسعود ابو منصور کو کھڑا لایا ہے۔ سلطان دڑتا ہوا آیا۔ اُس کے لیے یہ خبر معمولی نہیں تھی۔ ابو منصور کے ساتھ سمن تاش بھی تھی۔ انہیں سلطان اپنے پیچھے میں لے گیا۔

”کیا سلطان میری دوستی قبول کر لیں گے؟“ ابو منصور نے پوچھا۔

”میں نے دوستی کا ہی پیغام بھیجا تھا۔“ سلطان محمود نے کہا۔ ”مگر تم نے میرے بیٹے کو قتل کرانے کی کوشش کی۔۔۔ کیا میں تم پر بھروسہ کر سکتا ہوں؟ تم مجھے کس طرح یقین دلا سکتے ہو کہ تنہا ہی دو کتے میں خلوص ہے، تم میرے قیدی ہو۔“

”سب ٹھیک کہتے ہیں۔“ ابو منصور نے کہا۔ ”میرے پاس کچھ نہیں رہا پھر بھی آپ کی دوستی چاہتا ہوں۔ میں آپ کے خلاف لڑنا نہیں چاہتا تھا مگر۔۔۔“ اور اُس نے اقبال جرم کے اعجاز سے بتا دیا کہ وہ مجبور ہو کر اپنی فوج لے آیا ہے۔ سمن تاش کھڑی سن رہی تھی۔ وہ آگے بڑھ کر سلطان کے سامنے دھڑلے بگمگی اور سلطان کا ہاتھ چوم کر کہا ”کیا آپ کے دل میں میرے لیے کچھ جگہ ہے؟“ اُس نے مسعود کی طرف دیکھا اور سلطان محمود سے کہا۔ ”میں یہ دوستی کئی کر سکتی ہوں۔“

قادر خان کی پیشقدمی ترک گئی تھی۔ وہ اپنی فوج کو دھتور میں تقسیم کر کے توغان خان اور ابو منصور کو کمک پہنچ رہا تھا۔ سلطان محمود کو اس کے اس اقدام کا پتہ اس وقت چلا جب رات گہری ہو رہی تھی۔ اس دھت جلد نہیں کیا جاسکتا تھا۔ سلطان نے اپنے پلان میں رد و بدل کر لیا اور اُنسی وقت مسعود اور دوسرے سالار کی طرف پیغام بھیج دیا کہ نازہ صورت حال کیا ہے۔

مسعود اپنی جگہ نہیں تھا۔ وہاں ایک نائب سالار نے پیغام وصول کیا۔ مسعود کم دیش ایک سو منتخب سپاہیوں اور چھاپہ مار گناہداروں کو ساتھ لے کر ابو منصور کے ہیڈ کوارٹر پر حملہ کرنے چلا گیا تھا۔ یہ ایک ٹخون تھا۔ ابو منصور جو صدمہ برداشت کر رہا تھا اس کی فوج بڑی طرح کھلی گئی تھی۔ سلطان محمود نے اُس پر حملہ ہی ایسے انداز سے کر لیا تھا کہ وہ بچ نہیں سکتا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کی نشاندہی کے مطابق دریا کے کنارے چلا گیا تھا۔ اُس کے ساتھ اس کا ایک سالار امیر تین بیویاں، چند ایک محافظ اور چند قاصد تھے۔ وہاں اس پر حملہ نہیں ہو سکتا تھا۔

مسعود دُور کا چکر کاٹ کر دہان تک پہنچا۔ اُسے وہیں شعلیں جلتی نظر آئیں۔ اُس نے اپنے آدمیوں کو ہدایات دیں اور انہیں پھیلا کر آگے بڑھا۔ ابو منصور کے صرف دو محافظ جاگ رہے تھے۔ ایک نے دوسرے سے کہا کہ وہ گھوڑوں کی آوازیں سن رہا ہے۔ دوسرے نے کہا کہ وہی ہوں گے۔ اُس نے ایک مشعل اٹھائی اور اوپر کر کے درتہ دایں بائیں طالی اور دو مرتبہ اوپر نیچے کی مشعل رکھ کر وہ ایک خیمے کے قریب جا کھڑا ہوا اور سمن سے وہی سی آواز نکالی۔ خیمے میں سمن تاش سوتی ہوئی تھی۔ وہ فوراً اُٹھ کر باہر آگئی اور محافظ سے کہا کہ تم آگے چلے جاؤ۔

چونکہ راہنما موجود تھی اس لیے ٹخون میں کوئی دشواری اور کوئی خطرہ نہ تھا۔ ابو منصور اور سالار اپنے اپنے خیموں میں سوئے ہوئے تھے۔ ان تک زخمیوں کی

سلطان محمود شاہ کچھ گیا۔ ابو منصور نے کہا۔ ”ہاں سلطان! میرے پاس یہی کچھ رہ گیا ہے۔۔۔ ایک مٹی۔۔۔ اس نے مجھے آپ کے خلاف لڑنے سے روکا تھا۔ اسے اپنی مٹی بنالیں۔“

سلطان محمود نے اُسی وقت یہ پیش قدمی قبول کر لی اور مسعود کی رضامندی سے سمن تاش کو اُس کی بیوی بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ لڑائی اور شادی ۱۰۲۰ء میں ہوئی تھی۔

دوسرے دن کی لڑائی فیصلہ کن تھی۔ ابو منصور نے اپنی فوج کو لڑائی سے الگ ہو جانے کا حکم بھیج دیا۔ سلطان محمود نے اُسے قیدی سے بہانہ بنالیا تھا۔ تادور خان اور توغان خان میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ڈیڑھ دو سال بعد ان دونوں نے بھی سلطان محمود کی اطاعت قبول کر لی تھی۔

دیوتا نے پنڈت کو بنگل لیا

بھارت میں کالنجہ، قنوج اور گوالیار ایک مثلت کی صورت میں واقع ہیں۔ اس مثلت میں سے ہندوؤں کے دو مقدس دریا، جہنا اور گنگا گذرتے ہیں۔ کئی ہندوؤں کے نام لے کر ان کی طرح پھیلے ہوئے ہیں۔ سلطان محمود غزنوی کے دور میں اس علاقے میں کچھ جنگلات تھے۔ نیلے نیکریاں اور پہاڑیاں بھی تھیں۔ یہ زمینوں مقامات ایک دوسرے سے ڈیڑھ دوڑھ سو میل دور ہیں۔ اُس دور میں جب غزنی کا بٹ حکمران ہندوستان پر دہشت بن کے چھا گیا تھا، یہ بڑی مشہور راجہ ہانہل تھیں۔ قنوج کے متعلق سنایا جا چکا ہے کہ بلند شہر، مستھرا، پنج اور چھوٹے بڑے کئی ایک قلعوں کی فتح کے بعد محمود غزنوی نے قنوج کو تہ تیغ کر لیا تھا اور قنوج کا مارا جہاں راجا پال جس کا بڑا شہر تھا، اسی محلے سے پہلے ہی بھاگ گیا تھا۔

کالنجہ کے متعلق یہ مفاہمت ضروری ہے کہ آپ پہلے بھی کشمیر کے حملے کی کہانی میں یہ نام پڑھ چکے ہیں۔ وہ دراصل کالانجہ ہے جو آج کو مل کھاتا ہے۔ اب جس جگہ کا ذکر ہو رہا ہے یہ کالنجہ ہے۔

۱۰۱۸ء کے آخری دنوں میں قنوج کا مارا جہاں راجا پال سلطان محمود غزنوی کے مقابلے سے پہلے ہی مرنے لگا تھا تو وہ کالنجہ، قنوج اور گوالیار کی مثلت سے نکل گیا تھا۔ راجا پال نے اپنا تمام تر خزانہ شہر سے دو ایک ایسی پہاڑی اور جنگلاتی جگہ چھپا دیا تھا جہاں ان لوگوں کا گذر کم ہی ہوتا تھا۔ اس کا راز وہاں صرف ایک

— سلطان محمود نے پرجوش آواز اور داد تحسین کے لہجے میں کہا ”مگر تم میں جو جرات ہے میں اس کی تعریف کرتا ہوں۔ غدار کسی بھی قوم کا اور کسی بھی مذہب کا ہونہ قابل نفرت ہے۔۔۔ کچھ پنڈت! کیا چاہتے ہو؟“

”اگر مجھ پر کرم کرنا چاہتے ہیں تو مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔“ پنڈت نے کہا۔ ”میں اپنی آنکھوں اپنے مذہب کی توہین نہیں دیکھ سکتا۔ میں اپنے آپ کو گنگا ماما کے حوالے کر دوں گا یا جنگل میں نکل جاؤں گا اور ہائی ٹیرریز گزاردوں گا۔“

”جاد پنڈت!“ سلطان محمود نے کہا۔ ”جلتے ہوئے قنوج کے دروازے کھلے ہیں چلے جاؤ۔ اگر اپنے مارا جے سے کہیں ملاقات ہو جائے تو اُسے کناکر جنگجو بادشاہ اپنی قوم اور اپنے ملک کے ساتھ دھوکہ نہیں کیا کرتے۔“

پنڈت سر جھکا نے ہوئے چلا گیا۔

۲۵ دسمبر ۱۱۱۸ء کا دن تھا جب سلطان محمود غزنوی نے قنوج کا محاصرہ کیا تھا۔ کوئی بھی نہتا سکا کہ مارا دیکھ قنوج سے نکل گیا تھا۔ اُس کے تعاقب کی ضرورت بھی محسوس نہ کی گئی۔ تھوڑی دیر بعد سلطان محمود غزنوی چلا گیا اور قنوج میں اپنے ایک سالار ابو القدر سلجوقی کو چھوڑ گیا۔

پنڈت جو سلطان محمود کو یہ کہہ کر وہ گنگا میں ڈوب مرے گا یا باقی عمر جنگل میں گزار دے گا، گھوڑے پر سوار قنوج سے دوڑ نکل گیا تھا۔ اُس نے اور دور جا کر گھوڑا دیر یا میں ڈال دیا۔ دریا گہرا تو تھا مگر خاموش تھا۔ وہ موسم سیلاب اور طغیانی کا نہیں تھا۔ گھوڑا اُسے آگے ہی آگے لے جاتا رہا لیکن پنڈت نے اپنے آپ کو گنگا ماما کے حوالے نہ کیا اور گھوڑا اُسے پار لے گیا۔ آگے گھٹا جنگل تھا۔ پنڈت نے گھوڑے کو آرام دیا اور اُسے چرنے چھپنے کے لیے چھوڑ دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور جنگل میں داخل ہو گیا۔ جنگل گھٹا بھی تھا، کم گھٹا بھی اور کہیں کہیں درخت تھے ہی نہیں۔ راستے میں دو تین مذاہب بھی آئیں۔ چٹانوں کی بھول بھدیاں بھی آئیں۔ سورج غروب ہوا۔ رات اندھیری ہوتی چلی گئی۔ اُس کا گھوڑا چلا گیا۔ آخر وہ

پنڈت تھا اور لہجے میں محمود غزنوی کا ایک جاسوس اس خزانے کے راز سے واقف ہوا تھا۔ اُس نے قنوج کی فتح کے وقت اس پنڈت کو پکڑا دیا تھا مگر پنڈت نے سلطان کو بتایا تھا کہ وہ اُسے خزانے کی جگہ لے جاسکتا ہے لیکن وہاں خزانہ نہیں ہوگا۔ وہ راجا پال اپنے ساتھ لے گیا ہے۔

”وہ کیا کہاں ہے؟“ سلطان محمود نے اُس سے پوچھا۔

”اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں بھی اُس کے ساتھ چلا جاتا۔“ پنڈت نے جواب دیا تھا۔ ”آپ کا قیدی نہ ہوتا۔“

”میں بتایا گیا ہے کہ تم واحد آدمی تھے جو مہاراجہ کے خزانے کے راز سے واقف تھے۔“ سلطان کے ایک سالار نے اُس سے پوچھا۔ ”یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ مہاراجہ ہمیں بتائے بغیر چلا گیا ہو؟“

”خزانے سے جسے پیار ہو وہ انسانوں کے پیار سے محروم ہو جاتا ہے۔“ پنڈت نے کہا۔ ”جو مہاراجہ اپنے دیوتاؤں اور دیویوں کو اور اپنے مندروں کو توہین و بربادی کے لیے چھوڑ گیا ہے، اُس کے لیے مندروں کا ایک ہجاری کوئی سنی نہیں رکھتا تھا۔ مجھے اُس کے خزانوں کے ساتھ دیکھی ہوئی تو تمام تر خزانہ میری تحویل میں رہا ہے۔ میں اسے غائب کر سکتا تھا مگر میں نے اس کی خاطر آپ کا ایک آدمی سانپوں سے مرادیا ہے۔ آپ میرے ساتھ چلیں۔“

آپ کو وہ جگہ دکھا دوں گا۔ مندروں میں جو کچھ ہے وہ آپ کے حوالے کیا جا چکا ہے۔

”کیا آپ اسلام قبول کریں گے؟“

”نہیں۔“ پنڈت نے کہا تھا۔ ”جس طرح آپ کے آدمی میرے دیوتاؤں کو مٹی اور پتھر کے بت کچھ کر توڑ رہے ہیں اسی طرح میرے جسم کے بھی ٹکڑے کر دیں۔ اپنا مذہب نہیں چھوڑوں گا۔ اگر آپ اپنے مذہب کو سچا سمجھتے ہیں تو دوسرے مذہب کے میثیادوں کا احترام کریں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کا مذہب بھی یہی کہتا ہے۔“

”میں نے تمہارے مذہب کے میثیادوں کو اپنے قدموں میں سر درگرتے دیکھا ہے۔“

رک گیا۔ علاقہ زیادہ دشوار گزار ہو گیا تھا۔ اُس نے گھوڑے سے اتر کر اندھیرے میں گھاس پھوس اور خشک ہڈیاں اکٹھی کر کے انہیں آگ لگا دی۔ سردی تھی اور درندوں کا غلو بھی تھا۔ اُس نے اپنے ارد گرد خشک جھاڑیاں اور ہڈیاں لہر گھاس پھوس جلاتے رات گزار دی۔ صبح وہ پھر گھوڑے پر سوار ہوا اور روانہ ہو گیا۔ اب وہاں کوئی راستہ نہیں تھا۔ بلیں زمین پر پھیل کر درختوں پر چڑھی ہوئی تھیں۔ کھڑ بھی تھے اور درخت اتنے زیادہ کہ ان کے جھکے ہوئے ٹنوں کے نیچے سے گزرنے کا محال تھا۔

اُس کا گھوڑا چلتا گیا۔ کچھ دیر تک تو چل کر کم گھا ہو گیا۔ آگ کے دو پہاڑوں کے درمیان کھلی جگہ تھی۔ پکھرے پکھرے درخت اور اوپری گھاس تھی۔ وہ چلتا گیا اور دونوں پہاڑوں کے درمیان گیا تو اُسے ایک پہاڑی میں سے راستہ نظر آ گیا۔ یہاں سے پہاڑی دو حصوں میں کٹی ہوئی تھی۔ وہ اس تنگ راستے میں سے گزر گیا۔ آگے ایک اور پہاڑی آگئی جو کہیں سے دیوار کی طرح عمودی تھی اور کہیں سے اوپر جھک کر آگے کو کھلی ہوئی تھی۔

اس وادی میں کچھ دُور اُسے نیچے دکھائی دیے۔ ان سے ہٹ کر دیکھتے ہوئے پتھر سے تھے۔ ان سے ذرا پرے گھوڑے اور چم بندھے ہوئے تھے۔ پنڈت نے گھوڑے کی لگام کو جھکایا اور ایر لگائی۔ گھوڑا دوڑ پڑا۔ چند ایک آدمی ہاتھوں میں تیردکان اور ہتھیال اٹھائے سامنے آ گئے۔

”پنڈت جی ہمارا ج میں“۔ کہنے لے بلند آواز سے کہا۔

قنوج کا ہمارا ج راجا پال بننے سے باہر آیا۔ اُس کے ساتھ اُس کی ملاں اور اُس کا بیٹا جھمن پال بھی گن کھڑا ہوا۔ یہ تھی وہ جگہ جہاں ہمارا ج راجا پال نے قنوج سے بھاگ کر پناہ لے رکھی تھی۔ س کی رانی اور بیٹے جھمن پال کے علاقہ میں ناپے اور گانے والیاں بھی تھیں۔ کم و بیش بچاس وفادار سپاہی تھے جو ہمارا ج کے محافظ تھے۔ چند ایک ملازم بھی تھے۔ پنڈت کو یہ جگہ معلوم تھی اور نہ وہ اس جگہ تک کبھی نہ پہنچ سکتا۔

پنڈت گھوڑے سے اُترا تو راجا پال نے آگے بڑھ کر اُسے بازو سے پکڑا اور اپنے خیمے میں لے گیا۔ رانی اور اُس کے بیٹے جھمن پال نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اُن کے چہروں پر اُسی اور پریشانی تھی۔ وہ اپنے خیمے میں چلے گئے۔

”کیا آپ مجھ سے یہ پوچھنے کی جرات کریں گے کہ آپ کی راجدھانی کس حال میں ہے؟“ پنڈت نے ہمارا ج قنوج سے پوچھا۔ ”کیا آپ میں سننے کی ہمت ہے کہ مسلمانوں نے قنوج میں مندروں کو کس طرح اجڑا ہے؟“ ہمارا ج راجا پال نے اُسے ایسی نگاہوں سے دیکھا جو خشکی تھیں۔ ان میں شکست اور بے بسی کا تاثر نہیں تھا۔

”میں جب وہاں سے رخصت ہوا اُس وقت قنوج جل رہا تھا۔“ پنڈت نے کہا۔ ”مندروں میں مسلمان سپاہی ہری کرشن ہمارا ج کے بہت گھسیٹ کر باہر لا رہے تھے اور انہیں توڑا جا رہا تھا۔ آپ کے محل میں...“

”آپ میرے لیے کوئی نئی خبر نہیں لائے۔“ ہمارا ج راجا پال نے اُس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”اس سلسلے میں آپ کے ساتھ بہت باتیں ہو چکی ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ غزنی کا سلطان محمود لڑنے میں بہت ماہر ہے۔ میں جانتا تھا کہ قنوج میں جب اُس کے مقابلے میں لڑنے والا کوئی نہیں ہوگا اور میں بھی اُسے نہیں ملوں گا تو وہ بھڑک اُٹھے گا اور وہ اپنا ختمہ قنوج کے درو دیوار پر ٹھنڈا کرے گا۔ وہ آسان فتح سے خوش ہونے والا نہیں۔ میں نے قنوج کو، اپنے قتل کو اور مندروں کو کسی خاص مقصد کے لیے قربان کیا ہے۔“

”مگر آپ نے اپنا خزانہ قربان نہیں کیا؟“ پنڈت نے کہا۔

”پنڈت جی ہمارا ج اُ۔ راجا پال نے کہا۔ ”آپ کے دماغ کی غرابی کا میرے پاس کوئی علاج نہیں۔ آپ ہر بات میں مذہب کو سامنے لے آتے ہیں۔ میں جانتا ہوں آپ کہیں گے کہ مجھے خزانے کے ساتھ پیار ہے... ان باتوں

سکتے، اور یہ عزت مند بگجوں کا شیوہ بھی نہیں۔ میں اب بھی آپ سے کہتا ہوں کہ اپنی جس فوج کو آپ نے قنوج سے باری پلے جانے کا حکم دیا تھا، اُسے تیار کریں۔ باری کو اپنی راجدھانی بنالیں اور سلطان محمود کو یہاں سے نکالیں۔ اُس کی فوج تھوڑی رہ گئی ہے۔ لاہور کا مہاراجہ بھی پال پندر، گوالیار کا راجہ جرن اور کانہیر کا راجہ گندا آپ کا ساتھ دینے کو تیار ہیں۔ مسلمانوں کو آپ قتل کئے ہیں۔ آپ کی گدھی کو لوگ مقدس سمجھتے ہیں۔“

”سب سے پہلے غزانہ وہاں سے نکالنا ہے۔“ مہاراجہ راجا پال نے کہا۔ ”پھر سوچیں گے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ میں ساری عمر یہاں چھپ کر تو نہیں گزار سکتا۔“

ایک دن اور ایک رات کی مسافت کے بعد قافلہ اُس جگہ پہنچا جہاں پنڈت نے مہاراجہ قنوج کا غزانہ چھپایا تھا۔ یہ ایک پہاڑی تھی جس میں اوپر سے نیچے تک شگاف تھا جو اندر کو چلا گیا تھا۔ اس کی شکل کنوئیں جیسی تھی جس کی دیوار ایک طرف سے گرا دی گئی ہو۔ اوپر کے درختوں نے جھک کر اس پر سایہ کر رکھا تھا۔ گول دیواروں کے ساتھ بھی درخت تھے اور دیوار میں بھی تھے جو جھک کر زمین کے ساتھ ستوازی ہو گئے تھے۔ اس کنواں نمایں پانی کھڑا تھا جو دراصل دلمل تھی۔ اس کے کناروں اور غودی چٹان کے درمیان پانی سا رستہ تھا۔ سامنے والی دیوار جیسی چٹان کے دامن کے ساتھ مٹی اور پتھروں کی ٹیکری تھی۔ ٹیکری اور چٹان کے دامن کے درمیان ایک دہانہ تھا جو بھاری مٹاؤتوں میں چھپا ہوا تھا۔ یہ ایک غار کا دہانہ تھا۔ غار وسیع تھا۔ اس کے ایک طرف ایک ٹہرنگ کا مٹہ کھلا ہوا تھا۔ یہ سرنگ ایک اور غار میں چلی جاتی تھی۔ وہاں قنوج کا غزانہ پڑا تھا مگر جہاں سرنگ ختم ہوتی تھی وہاں ایک گہرا گڑھا کھودا گیا تھا۔ اس میں سانپ پھینک دیئے گئے تھے۔ گڑھے کے اوپر سرکنڈے ڈال کر ان پر مٹی ڈال دی گئی تھی تاکہ کوئی آدمی غزانے کا سراغ پالے اور وہ اندر جائے تو سرکنڈوں پر پاؤں رکھتے

کو ڈراؤن سے اتار دے مہاراجہ! مجھے یہ بتاؤ کہ میں جس مقصد کے لیے آپ کو وہاں چھوڑ آیا تھا وہ پورا ہوا یا نہیں؟

”نہیں۔“ پنڈت نے جواب دیا۔ ”آپ میرے ساتھ بارہ آدمی چھوڑ آئے تھے۔ آپ نے مجھے بتایا تھا کہ یہ درندے ہیں کسی سے نہیں ڈرتے اور انہیں بگوان نے انسانوں کو قتل کرنے کے لیے دنیا میں بھیجا ہے۔ آپ نے بتایا تھا کہ ان میں عقل اتنی زیادہ ہے کہ بڑا کامیاب فریب دیتے ہیں اور قتل کر کے غائب ہو جاتے ہیں۔ آپ نے کہا تھا کہ ان سے سلطان محمود کو قتل کرانا ہے، اور اگر یہ ممکن نہ ہو سکے تو اُس کے بڑے بڑے سالاروں کو قتل کر دیں آپ نے مجھ پر چھوڑا تھا کہ ان کے ہاتھوں اور کس کس کو قتل کرانا ہے۔“

”میں یہ سننے کے لیے قیام ہوں کہ آپ نے جس کس کو قتل کرنا ہے۔“

مہاراجہ راجا پال نے پوچھا۔

”کبھی ایک کبھی نہیں۔“ پنڈت نے کہا۔ ”میں نے آپ کے ان باغیوں درندوں کو جو آپ کہتے تھے کہ موت سے نہیں ڈرتے، غریب مزدوروں کے لباس میں اپنے ساتھ لکھا مگر مسلمان فوج شہر میں داخل ہوئی تو لوٹ مارت شروع ہو گئی اور مکان چلنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ بارہ میں سے دس غائب ہو گئے۔ مجھے اُمید تھی کہ وہ اپنا کام کرنے گئے ہیں مگر تھوڑی دیر بعد میں نے باقی دو کو ان کی تلاش کے لیے بھیجا تو پتہ چلا کہ وہ بھی لوٹ مارت میں شامل ہو گئے ہیں اور ان میں سے بعض شہر سے چلے گئے ہیں۔ میں نے باقی دو سے پوچھا کہ وہ کسی کو قتل کر سکیں گے یا نہیں؟

نے جواب دیا کہ مہاراجہ خود تو غزانہ لے کر بھاگ گیا ہے، ہم کس کے لیے کسی کی جان لیں اور اپنی جان کو خطرے میں ڈالیں؟ اور وہ بھی میرا ساتھ چھوڑ گئے۔“

مہاراجہ قنوج نے سر جھکا لیا۔

”مہاراجہ!“ پنڈت نے کہا۔ ”وہ ٹنگ حرام نہیں تھے لیکن وہی وہاں نہ تھا جس کا انہوں نے ٹنگ کھایا تھا تو انہوں نے اتنا بڑا خطرہ مول لینا بیکار سمجھا اور مہاراجہ کسی بادشاہ کو قتل کر کے آپ اُس کی فوج کو شکست نہیں دے

ہی گڑھے میں جا پڑے جمال زہریلے سانپ چھوڑ دیئے گئے تھے۔

اب جو قائد اس جگہ آیا، اس میں ہمارا جھنڈ تھا اور پنڈت بھی بہت سے فخر اور گھوڑے تھے اور ان کے ساتھ دس بارہ ملازم تھے۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں قنوج کے محاصرے سے پہلے پنڈت چند آدمیوں کو اس حالت میں بیاں لایا تھا کہ ان کی آنکھوں پر زینیاں بندھی ہوئی تھیں اور وہ ایک رسی پکڑے ہوئے آئے تھے۔ رسی کا اگلا سر پنڈت کے ہاتھ میں تھا۔ وہ خزانے کے کچھ کس رکھنے آئے تھے۔ اس جگہ کو ملازموں سے بھی چھپا کر رکھا تھا۔

اب ہمارا جہاز اور پنڈت خزانہ نکالنے کے لیے آئے تو کسی بھی ملازم کی آنکھوں پر پٹی نہیں بندھی تھی۔ انہیں سرنگ میں داخل کرنے سے پہلے اس گہرے گڑھے پر جس میں زہریلے سانپ چھوڑے ہوئے تھے، سختی کرکھ دیئے گئے۔ پنڈت ان سے گزر کر اندر دلی غار میں چلا گیا اور ملازموں کو بھی اندر بلا لیا گیا۔ وہ کس باہر لاکر فخر دن اور گھوڑوں پر لاوٹے گئے۔ یہ ایک ریاست کا خزانہ تھا جو ہمارا جہاز را جیا پال کے آباد اجداد سے جمع تھا اور بڑھاپی رہا تھا۔ مسنون کے حساب سے سونا تھا، چاندی تھی، اینیرے جواہرات اور نقدی تھی۔ اسے باہر لانے کے لیے ملازم کو کئی بار اندر جانا پڑا۔

جب آخری کبس بھی باہر آگیا اور تمام کبس گھوڑوں اور فخریوں پر لاو دیئے گئے تو پنڈت تمام آدمیوں کو غار میں لے گیا اور خود باہر آگیا۔ وہ ابھی سرنگ میں تھا۔ سانپوں والے گڑھے پر تین تختے رکھے گئے تھے۔ اس نے بڑی تیزی سے تیغوں تلے کھینچ لیے اور انہیں گھسیٹ کر باہر لے آیا۔

”جو ہمارا جہاز۔ پنڈت لے ہمارا جہاز را جیا پال سے کہا۔

”وہ سب کہاں ہیں؟“ را جیا پال نے پوچھا۔

”وہ اب کبھی باہر نہیں آسکیں گے۔“ پنڈت نے جواب دیا۔ ”انہیں اندر بھیج کر تختے کھینچ لایا ہوں۔ بھٹنے والے آگے بڑھیں گے تو اس گڑھے میں گرں گے جو میں نے زہریلے سانپوں سے بھر رکھا ہے۔ ایک دو گریں گے تو باقی آگے

پہن آئیں گے۔ بھوکے پیاسے اندر ہی مر جائیں گے۔“

”کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ انہیں زیادہ انعام دے دیا جائے اور ان کی مرے

دقت کی بدولت نہ لی جائیں؟“

”ہمارا جہاز۔ پنڈت نے کہا۔“ جس طرح آپ نے اس خزانے کی خاطر اپنا

مذہب، اپنا دھرم اور اپنی قوم کو قربان کر دیا ہے اسی طرح ہر انسان اتنے زیادہ

خزانے کی خاطر آپ کو بچھے، آپ کی رانی اور بیٹے کو قتل کرنے کی سوچے

گا۔ اتنے بڑے خزانے میں سے کوئی انسان تھوڑا سا نہیں لینا چاہتا۔ آپ نے

اپنی رعایا کے ساتھ کوئی نیکی کی ہے؟ انسان جب تخت پر بیٹھا اور سر پر

تاج رکھتا ہے تو اس کی نظریں رعایا سے ہٹ جاتی اور خزانے پر جم جاتی ہیں۔ وہ

انسان سمجھتا نہیں، سوچتا نہیں کہ خزانے اور حکومت کا پیار اسے اس حال تک پہنچا

دیتا ہے جس میں آج آپ ہیں۔ آپ ڈرے ہوئے گیدڑ کی طرح چھپتے پھرتے ہیں۔

ہیں۔ اپنی رعایا کو جو آپ کی ہم مذہب ہے آپ نے اپنے دشمن کے حوالے کر

دیا ہے۔“

”پنڈت جی ہمارا جہاز آپ مجھے بار بار تشرسار نہ کریں۔“ ہمارا جہاز را جیا پال

نے کہا۔ ”میں کچھ کر کے دکھاؤں گا۔“

”میں اسی لیے آپ کے ساتھ ہوں کہ آپ کچھ کر کے دکھائیں۔“ پنڈت

نے کہا۔ ”آپ بھول گئے ہیں کہ قنوج کی گدے سی ہندو جاتی کی بہادری کی علم دہن

کی اور ہندوستان کے فدا کی علامت ہے۔ تمہا دے ہمارا ہے آپ کو اپنا سردار

مانتے تھے۔ اب بھی مانتے ہیں۔ میں آپ کو اس مشکل سے نکالوں گا۔ چلتے۔

بیٹل پرکنا بہت خطرناک ہے۔“

وہ چل پڑے۔ غلہ کے اندر سے آدازیں آ رہی تھیں جن آدمیوں کو اندر

بند کر آئے تھے وہ پنڈت کو پکار رہے تھے۔ پنڈت اور را جیا پال دو گھوڑوں اور

فخریوں کو ایک دوسرے کے پیچھے ہاندھے دوڑ رہی دُور پہنچے جا رہے تھے۔ آگے

ایں جنگل اور ایسا دشوار گزار علاقہ تھا جہاں دندے اور جنگلی جانور ہو سکتے تھے، کسی انسانی کاگز ممکن نہیں تھا۔

”پنڈت جی!“ راجیا پال نے کہا۔ ”آپ کی دفا داری نے میرا سر جھکا دیا ہے۔ میں آپ کو اتنا انعام دینا چاہتا ہوں جتنا آج تک کسی نے تجھ سے وصول نہیں کیا۔ اپنے منہ سے مانگو۔ کیا انعام دوں!“

”ایک انعام ہے جو آج تک کوئی مہاراجہ کسی وفادار کو نہیں دے سکا۔“ پنڈت نے کہا۔ ”آپ دے سکتے ہیں۔“

”مانگو مہاراج! کہو کیا دوں؟“

”غزنی کے سلطان کا سر۔“ پنڈت نے کہا۔

مہاراجہ راجیا پال کی ہنسی نکل گئی۔

”یہ مجرم سے الگ ہو جائے تو نہ صرف یہ کہ ہندوستان کو آئے دن کے حملوں سے نجات مل سکتی ہے، بلکہ اسلام کا پھیلنا ہمیشہ کے لیے رک سکتا ہے۔“

پنڈت نے کہا۔ ”یہ دھڑلہ ہمیشہ کے لیے پاک ہو سکتی ہے مگر مجھے نظر آتا ہے کہ ہماری آنے والی سلیس پھل مسلمانوں کے خلاف لڑائی رہیں گی، اکشت و خون ہوتا رہے گا لیکن اسلام اس ملک سے نہیں نکلے گا۔ ہمارے بعد آنے والوں میں عقل ہوئی تو وہ لڑنے مرنے کی بجائے مسلمانوں کو ختم کرنے کے کچھ اور طریقے اختیار کریں گے۔ اگر ہم مسلمانوں کو اپنی دھڑلہ مانتا سے نکال نہ سکیں تو یہی کافی ہوگا کہ ہم اسلام اور اس مذہب کے پیروکاروں کے خلاف اتنی نفرت پیدا کر دیں کہ کوئی ہندو اسلام قبول کرنا تو درکنار مسلمان کے قریب سے گزرنے سے بھی سمجھ کر بھاگ ہو گیا ہے۔“

”مہاراج!“ مہاراجہ راجیا پال نے کہا۔ ”مجھے اپنے مذہب سے نفرت

ہوتی جا رہی ہے۔ ہر ہر مہادیو اور ہری کرشن نے ہماری کیا مدد کی ہے؟ آپ ہیں ہمیشہ دیوتاؤں کے قہر سے ڈراتے ہیں۔ کیا ان کے پاس صرف قہر ہے کرم نہیں؟ ہر بار اور ہر جگہ فتح مسلمانوں کی ہی کیوں ہوتی ہے؟ آپ کے مہادیو کا ہر مسلمانوں

پر کیوں نہیں گرتا؟

”یہ دیوتاؤں کے بھید ہیں۔“ پنڈت نے کہا۔ ”جب انسان دیوتاؤں کا حکم نہیں مانتا تو وہ اُس کے دماغ میں خلل ڈال دیتے ہیں، پھر وہ ایسی ہی باتیں کرتا ہے جیسی آپ کر رہے ہیں۔“

گھوڑے چلے جا رہے تھے۔ دُور بھٹیڑیوں کی چیخ دیکار اور لکڑیوں کی قہقہہ آوازیں اور کھمبھی کھمبھی کسی شیر کی بھاڑ بنائی ہوئی تھی۔ گھوڑے دشوار گزار علاقے سے گزر رہے تھے۔

”میں نے مندروں کو ہر دی اور جواہرات سے سجایا ہے۔ راجیا پال کہتا جا رہا تھا۔“ میں نے پنڈتوں، ریشیوں اور سادھوؤں کی بہت خدمت کی ہے۔ آپ کے مندر کو اور اس میں رکھے ہوئے پتھر کے دیوتاؤں کو میں نے عطر سے نہلایا ہے۔ میرا تخت کہاں ہے؟ میرا تاج کہاں ہے؟ قہوج کی وہ گدگی کہاں ہے جس کے گن سارا ہندوستان گاتا تھا؟ مجھے کیا سوجھی کہ میں مسلمانوں کی قہوج کے آنے سے پہلے ہی بھاگ اٹھا؟ مجھے کس نے اشارہ دیا تھا؟

”خزانے کے پیارے۔“ پنڈت نے کہا۔ ”آپ خود دل چھوڑ بیٹھے۔“

سوال کا جواب نہیں دے سکتے۔ میں خود اپنے سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔ پنڈت جی مہاراج آپ مجھے آج تک نہیں سمجھا سکے کہ مذہب کیا ہے میں ہی کچھ سمجھا ہوں کہ کسی گمراہ کاروبار میں چلا جائے تو رعایا اُسے اچھا سمجھنے لگتی ہے۔ آج تک یہی سمجھا ہوں کہ رعایا کو مذہب کے نام پر دھوکہ دیا جاسکتا ہے، اپنے دل میں مذہب کی محبت ہو یا نہ ہو۔ قہوج کی گدگی کی سارا ہندوستان صرف اس لیے پوچھا کرتا ہے کہ میرے باپ دادا آپ کے بیٹوں کو عطر سے نہلاتے رہے ہیں۔ میں نے اس رسم کو بھلی رکھا لیکن میرے دل میں اپنے مذہب کی محبت کبھی بھی پیدا نہ ہو سکی۔

”آپ گمراہ ہو گئے ہیں مہاراج!“

”ہاں!“ راجیا پال نے کہا۔ ”میں گمراہ ہو گیا ہوں۔ کیا آپ کو یاد نہیں رہا کہ میں نے ستر میں ہری کرشن کے قدموں میں بیٹھ کر کہا تھا کہ میرے سامنے

دیویدوں دیوتاؤں کی بات نہ کرو؛ اتحاد پیدا کرو اور مل کر محمود کا مقابلہ کر دیکر ایسا نہ ہوا۔ سب نے شکست کھائی۔ میں نے سنا ہے کہ لاہور کے ہمارا جو لے لہنا لی جالوں کی قربانیاں بھی دی تھیں۔ نوجوان لڑکیوں کو قتل کر کے ان کے خون سے دیوتاؤں کے پاؤں دھوئے رکھے مگر انہیں شکست ہوئی۔

”میں آپ کو اپنے مذہب کا کرشمہ دکھاؤں گا۔ پنڈت نے کہا۔

”میں نے کرشمے دیکھ لیے ہیں۔ راجا پال نے کہا۔ ”مجھے یہ بتا دو مسلمان میں وہ کونسی طاقت ہے کہ اتنی دُور سے آتے ہیں۔ ان کی فوج تھوڑی ہوتی ہے۔ ان کو رسد نہیں مل سکتی مگر وہ ہمیں شکست دے جاتے ہیں۔۔۔۔۔ آپ مجھے جواب نہیں دے سکتے۔ میں آپ کو بتا ہوں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ ایک بار ایک مسلمان جاسوس کو پکڑ لائے تھے۔ آپ بھی موجود تھے۔ ہم اُس سے پوچھتے تھے کہ اُس کے اہل ساکن کمال کمال ہیں اور یہ بھی کہ عموں کا اب ارادہ کیا ہے آپ کو یاد ہو گا کہ اُس نے کیا جواب دیا تھا۔“

”اے اے، یاد ہے۔“ پنڈت نے کہا۔ ”اُس نے کہا تھا کہ میرے ہم کے کرشمے کر دو، میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔“

”اور اُس نے کچھ نہیں بتایا تھا۔“ ہمارا راجا پال نے کہا۔ ”میں نے اُسے سونے کے ٹکڑے دکھائے تھے۔ وہ نہیں مانا تھا۔ میں نے راج محل کی سب سے زیادہ خوبصورت نقاشہ اُس کے حوالے کر دی تھی۔ وہ ہنس پڑا تھا اور اُس نے کہا تھا کہ میرے ایمان کو تم خرید نہیں سکتے۔ پھر آپ ایک پٹاری لے آئے تھے جس میں بڑا ہی زہر ملا سانپ تھا۔ آپ نے اُسے کہا تھا کہ آپ اُسے اس سانپ کے ساتھ کال کوٹھڑی میں بند کر دیں گے۔ وہ اس سے بھی نہیں ڈرا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ ایمان کو سانپ نہیں ڈس سکتا۔“

”اے اے ہمارا راج!“ پنڈت نے کہا۔ ”مجھے یاد ہے۔ ہم نے اُسے تنگ سی کوٹھڑی میں بند کر کے اس میں سانپ چھوڑ دیا تھا مگر یہ آدمی سانپ کے زہر سے تڑپ تڑپ کر مر گیا تھا، اُس نے مارکی کوئی بات نہیں بتائی تھی۔“

”یہ جے مسلمانوں کی قوت!“ ہمارا راج نے کہا۔ ”یہ ایمان کیا ہے؟“
”ایسے ہم دھرم کہتے ہیں۔“ پنڈت نے کہا۔ ”ہم میں بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔“
”ہائیں۔ ہائیں کھوکھلی اور بے جان ہائیں۔“ ہمارا راج نے آہ لے کر کہا جیسے اُسے پنڈت کی باتوں کے ساتھ کوئی کچھی نہ ہو۔ آپ کو مذہب سے ہٹ کر کوئی بات کرنی نہیں آتی یا آپ کو سانپوں کے ساتھ کچھی ہے۔ آپ سانپ پکڑنا اور پالنا جانتے ہیں۔“
جب یہ خزانہ اپنے پہلے ڈھکے چھپے ٹھکانے پر پہنچا تھا اُس وقت سلطان مگڑ بڑی احتیاط سے قلعہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اُسے بتایا گیا تھا کہ اُس کا اصل اور بڑا ہی خوریزمقاہ قلعہ میں ہو گا۔ کوئی جاسوس اُسے یہ نہیں بتا سکا تھا کہ قلعہ میں مقابلہ ہو گا ہی نہیں اور وہاں ہمارا راج بڑے نام فوج چھوڑ کر اور اُس کے سالاروں کے خفیہ قتل کا انتظام کر کے غائب ہو چکا ہے۔ اس سلسلے کی ایک تسط میں سنایا جا چکا ہے کہ غزنی کے ایک جاسوس کی اسی پنڈت کے ساتھ اسی خزانے والے غار میں ملاقات ہو گئی تھی اور پنڈت نے یہ جان کر کہ یہ غزنی کا جاسوس ہے، اُسے یہ غلط اطلاع دے کر گمراہ کیا تھا کہ قلعہ میں کئی نوپیں جمع ہیں جو غزنی کی فوج کو کچل کر رکھ دیں گی۔

جاسوس ضلع بروک نے اسی اطلاع کو مستند سمجھ کر سلطان محمود کو چوکنا کر دیا تھا۔ سلطان محتاط ہو کر اور قدم پھونک پھونک کر آگے بڑھتا رہا اور ہمارا راجا پال قلعہ سے نکل گیا۔ پنڈت دراصل وقت چاہتا تھا کہ وہ راجا پال کو محکمہ مقابلہ کرنے کے لیے روک لے لیکن راجا پال مڑ موڑ گیا۔ اگر سلطان محمود اپنی مخصوص رفتار سے پیش قدمی کرتا جسے صحیح معنوں میں برق رفتار پیش قدمی کہتے ہیں اور جس کے لیے غزنی کی فوج شہرت یافتہ تھی تو وہ راجا پال کے فرار سے پہلے قلعہ پہنچ جاتا مگر پنڈت کا دھوکا کامیاب رہا۔

راجا پال اور پنڈت نے خزانہ اپنے ٹھکانے پر پہنچا دیا۔ وہاں ایک قدرتی غار تھا جسے انہوں نے اور زیادہ لمبا کر لیا تھا۔ رات کو جب اتنے زیادہ ہنس

کے ماتھے میں بہت کچھ ہے۔“
 ”میں یہی سوچ رہا ہوں۔“ پنڈت نے کہا۔ ”ہمارا ج کے دماغ پر
 قابو پانے کی کوشش کروں گا.... میرا حساب بتا رہا ہے کہ ایک انسان کی
 قربانی دینی پڑے گی۔ ایک لڑکی کا خون بہانا پڑے گا۔“
 ”لڑکی کہاں سے آئے گی؟“

”میں نے دیکھ لی ہے۔“ پنڈت نے کہا۔ ”وہ ناپچنے والی جو سب
 سے چھوٹی ہے... ننڈیا۔“

”کریں۔“ رانی نے کہا۔ ”آپ جب چاہیں اسے قربانی کے لیے لے
 سکتے ہیں۔ وہ بہت خوبصورت ہے اور نوجوان بھی ہے۔ قربانی ایسی ہی لڑکی
 کی ہونی چاہیے۔“

باری دیسے گنگا سے دور ایک قصبہ تھا جو قنوج سے تین دنوں کی
 مسافت پر تھا۔ یہ قنوج کی ریاست میں تھا۔ تمام سوزنیں نے لکھا ہے کہ
 ہمارا راجا جیالال نے باری کو اپنا دارا گھومت بنالیا تھا جہاں اس نے اپنے
 بیٹے پھمن پال کو بھیج دیا تھا۔ اس نے باری کو قنوج کے پیمانے کا شہر بنانے
 کے لیے تعمیر شروع کرادی تھی۔ اس نے اپنی نوج قنوج کے محاصرے سے پہلے
 ہی باری بھیج دی تھی لیکن جنگل میں وہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ کیا کرے۔ سلطان محمود
 اس پر آسیب کی طرح غالب آگیا تھا۔ ایک سوزن بھٹا بھڑی نے یہاں تک
 لکھا ہے کہ ہمارا راجا جیالال دہرودہ اسلام قبول کرنے کا ارادہ کر چکا تھا۔

جنگل کی ایک رات تھی۔ ہمارا راجا کو یہاں آئے دیر لڑھکے دو بیٹے گرنچکے
 تھے۔ پنڈت اپنے خیمے میں عبادت میں مصروف تھا۔ گھٹاؤں کی گرج سائی دی
 اور ہوا تیز ہوگئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد کھل چکی اور بڑی زور کا دھماکا ہوا۔ اس
 کے بعد کھلی بار بار چکنے اور کرکنے لگی۔ جنگل دودھ کی مانند سفید روشنی سے روشن
 ہو جاتا تھا۔ اتنی زور کا مینہ برسنے لگا جیسے ٹالہ باری ہو رہی ہو۔ اس

دہاں پہنچے تو محافظوں میں سے صرف چار پانچ کو اس اعتماد میں لیا گیا کہ ان سے
 بکس اترنا اگر غار میں رکھوائے جائیں۔

اس سے اگلی رات دہاں جٹن منایا گیا۔ شراب کا ذخیرہ ساتھ تھا ناپچنے
 اور رگانے والیاں بھی تھیں۔ ان کے ساندے بھی تھے۔ رات کو شیطاں جلا
 کر جنگل میں منگل بنا دیا گیا۔ ہمارا راج نے اپنے محافظوں کو خوب عیش کرائی اساتیں
 نقد انعام بھی دیئے۔ اب اس کی زندگی اور سلامتی کا دارومدار انہی چند
 ایک محافظوں پر تھا۔ انہیں وہ بہت بڑی قیمت دے کر بھی خوش رکھنے کی
 کوشش کر رہا تھا۔

اس جٹن میں دو افراد نہیں تھے۔ ایک تو پنڈت تھا اور دوسرے
 اس کی رانی۔ ہمارا راجا جیالال دونوں کی غیر حاضری کو محسوس نہیں کر رہا تھا۔
 پنڈت اپنے خیمے میں عبادت میں مصروف تھا۔ اس نے چھوٹے چھوٹے دو بت
 اپنے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ عبادت کے بعد وہ کوئی مذہبی کتاب پڑھ رہا تھا
 کرائی خیمے میں آئی۔ وہ بوڑھی ہوگئی تھی۔ راجا جیالال کو اس کے ساتھ اتنی سی
 دیکھی رہ گئی تھی کہ وہ اس کے جوان اور اپنے جانشین بیٹے کی ماں تھی۔ وہ پنڈت
 کے پاس بیٹھ گئی۔

”کیا آپ نے بکھنے کی کوشش کی ہے کہ ہمارا ج کیا کر رہے ہیں اور ان
 کے ارادے کیا ہیں؟“ پنڈت نے رانی سے پوچھا۔ ”کیا یہ موقع خوشیاں
 منانے اور شراب پینے کا ہے؟“

”میں کچھ نہیں سمجھ سکتی۔“ رانی نے جواب دیا۔ ”میری نگاہیں اب اپنے
 بیٹے پر لگی ہوئی ہیں۔ اس کا مستقبل تاریک ہو گیا ہے۔ ہمارے ماتھے میں باری ہے
 جسے ہم قنوج کی طرح اپنی راجدھانی بنا سکتے ہیں۔ قنوج ہمیں واپس نہیں مل
 سکتا.... میرا خیال ہے کہ ہمارا ج پاگل ہو چکے ہیں۔ میں ان سے کوئی بات
 پوچھتی ہوں تو بھے یوں ٹال دیتے ہیں جیسے راج کے ساتھ میرا کوئی تعلق
 ہی نہ ہو.... کیا آپ کچھ نہیں کر سکتے؟ کوئی ٹونہ اکوئی جادو کر دکھائیں۔ آپ

اب طوفان میرا کیا بگاڑ لیس گے۔ اب بھیاں مجھے نہیں ڈر سکتیں... لے جاؤ میرا خزانہ۔

ہنڈت نے بارش اور سیلاب کے شور سے بلند آواز میں کہا: ”مہاراج! آپ کو کیا ہو گیا ہے! باہر شیطان بیچ رہے ہیں۔ اس قدر کو کھینچیں۔ میں جو کہتا ہوں وہ کریں۔ ہاتھ جوڑیں۔ میں جو پڑھتا ہوں وہ آپ بھی پڑھتے جائیں۔“ مہاراج ایک بار پھر مہنا کھینچاں جو جوان راجا اور لڑکھو تھا، چہرے پر خوف کے آثار لیے اور ہاتھ جوڑے ہوئے کچھ بڑبڑاتا تھا۔ اُس کے منہ سے گھٹلی ہوئی آواز نکلی۔ ”وہ دیکھو۔“

مہاراج اور ہنڈت نے غار کے دہانے کی طرف دیکھا۔ ایک اندھا جس کا سر انسان کے سر جتنا بڑا تھا، غار میں داخل ہو رہا تھا۔ کھینچ پال کے پاس تلوار تھی جو اُس نے نکال لی۔ اڑدہ آہستہ آہستہ رنگتار آ رہا تھا۔ شاید سیلاب میں کہیں سے بہتا آیا تھا۔ ایسے اڑدہ دلدل یا پانی میں رہتے ہیں۔ دماغ خورک نہ ملے تو تنگی پر آ جاتے ہیں۔ یہ سالم انسان یا جانور کو نگل لیتے اور دو دو تین تین ہینے سوکے رہتے ہیں۔ ان کی لمبائی چھ سے بارہ فٹ تک ہوتی ہے۔ بعض اڑدہ اس سے بھی لمبے ہو سکتے ہیں۔

یہ جو غار میں داخل ہو رہا تھا، نو دس فٹ لمبا تھا۔ کھینچ پال نے تلوار نکالی تو ہنڈت نے اُسے آگے بڑھنے سے روک دیا۔ مہاراج اُٹھ کر پیچھے ہٹ گیا۔ ہنڈت نے مشعل اٹھالی اور آگے کر دی۔ اڑدہ ابھی پورا غار میں نہیں آیا تھا۔ ہنڈت کو معلوم تھا کہ اڑدہ زہریلے نہیں ہو کر تے نہ یہ ڈستے ہیں، بلکہ یہ شکار کو تنگ کر تے ہیں۔

”ہنڈت جی مہاراج!“ مہاراج راجا پال نے کہا۔ ”آپ کو سانپوں کو پکڑنے اور قبضے میں رکھنے کی مہارت ہے۔ کیا آپ اس پر بھی قابو پا سکتے ہیں؟“

ہنڈت نے نظریں اڑدہ پر جمائے رکھیں اور مشعل کا شعلہ اُس کے اندر

وقت مہاراج راجا پال اپنے پیچھے میں نہیں بلکہ اُس غار میں تھا جس میں اُس نے ایک اور غار کھدوا کر خزانہ چھپا رکھا تھا۔ وہ اپنے پیچھے کو جانے لگا تو کھل اور بارش نے اُسے روک لیا۔

یہ ایک طوفانی بارش تھی۔ آسمان بھٹا جا رہا تھا۔ بجلی اتنی زور سے کڑکتی اور چمکتی تھی کہ دل دلتے تھے۔ غار میں ایک مشعل جل رہی تھی۔ باہر گھوڑے در کر رہنا رہے تھے۔ ہنڈت غار کے منہ میں سردار ہوا اور اندر چلا گیا۔ اُس نے مہاراج کو بتایا کہ وہ اُس کے پیچھے میں گیا تھا۔ وہ اُسے نہ ملا تو ادھر آ گیا۔ اُسے مہاراج کے متعلق فکر پیدا ہو گئی تھی۔ بارش اور تیز ہو گئی۔

دیر بھ ایک گھنٹے کے بعد باہر شور و غل مچا ہو گیا۔ گھوڑے بڑی زور سے ہینانے لگے۔ باہر بھگدڑ مچ گئی تھی۔ بارش کے شور کے ساتھ ایک اور شور سنانا دینے لگا اور اس کے ساتھ یہ گھبراہٹ ہوئی آوازیں۔ ”پانی آگیا... سیلاب آگیا...“

مہاراج اور ہنڈت نے غار کے دہانے میں سے دیکھا۔ بجلی چمکتی اور کڑکتی تھی تو انہیں سیلابی پانی عزائم دکھائی دیتا اور لوگ بھاگتے دوڑتے نظر آتے تھے۔ کھینچ پال دوڑتا غار میں آگیا۔ یہ جگہ دو پہاڑوں کے درمیان تھی۔ ان لوگوں کو تسلیم نہیں تھا کہ یہاں سے اُپر کے علاقے کا برساتی سیلاب گزرتا ہے۔ اب یہ سیلاب چڑھ رہا تھا۔ بارش اور تیز ہو گئی تھی۔ بجلی پہلے کی طرح کڑک رہی تھی اور اس کے ساتھ سیلاب عزائم ہو کر گزرتا تھا اور چڑھ بھی رہا تھا۔ مہاراج کے آدمی بلند جگہوں پر جا رہے تھے۔

پانی غار میں بھی آنے لگا۔ غدا ہوا پانی تھا اس لیے اندر تھوڑا پانی آ رہا تھا۔

”مہاراج!“ ہنڈت نے راجا پال سے کہا۔ ”یہ ہر بہر مہادیو کا قہر ہے۔ مہر جھٹالیں۔ معافی مانگیں۔ تو بہ کریں۔ کیا آپ نے ایسی بارش کبھی دیکھی ہے؟“ مہاراج نے قہقہہ لگایا جیسے اُس کا دماغی توازن صحیح نہ رہا ہو۔ ہولا۔

جا رہے تھے۔ مہاراج نے کسی سے کہا کہ پنڈت کو بلا لائے۔
پنڈت آیا تو مہاراج نے اُس سے پوچھا۔ ”رات اڑدہ کو مارا گیا تھا؟“
”وہ اڑدہ انیس دینا تھا۔“ پنڈت نے کہا۔ ”وہ آپ کو وہی بات کہنے آیا
تھا جو میں ایک عرصے سے آپ کو کہہ رہا ہوں۔ میں بھی اسے اڑدہ ہی سمجھا تھا۔
کوئی انسان اسے اڑدہ پر قابو نہیں پاسکتا۔ مجھے اشارہ جلاتوں میں نے
اسے رستے سے قابو کر لیا۔ آپ سو گئے پھر راجا جلا گیا تو اڑدہ نے مجھے اپنا
آپ دکھایا۔ میں اس کے ساتھ باہر نکل گیا۔ اُس نے کہا کہ مندر دل کی تباہی اور
ہماری توہین کا انتقام لو۔ ہماری رگوں کو بہت تکلیف پہنچ رہی ہے۔ ہم جب
آتے ہیں تو بھلیاں چمک چمک کر ہمارا راستہ روشن کرتی ہیں اور بارش ہمارا راستہ
دھو دالتی ہے۔ ہم اپنی بھلیاں ان پر بھی گرا سکتے ہیں جنہوں نے ہماری رگوں
کو تکلیف دی ہے لیکن ہم انہیں ہزار آجائے کا موقع دے رہے ہیں... دیوتا
نے مجھے کہا کہ اپنے راجہ سے کہو کہ اپنی راجدھانی میں مسلمانوں کی اذانیں بند کرو۔
یہ آوازیں ہمیں چین نہیں لینے دیتیں۔“

”دیوتا کہاں چلے گئے ہیں؟“ مہاراج قہقہے سے پوچھا۔ ”کہاں گئے ہیں؟“
”جہاں سے آئے تھے۔“ پنڈت نے کہا۔ ”میں نے ان کے قدموں میں
سر رکھ کر معافی مانگی ہے۔ آپ کی طرف سے بھی ہاتھ جوڑے تھے مگر وہ سخت
ناراض تھے۔ کہتے تھے کہ ان کی بھلیاں ان ہانڈوں کو جڑوں سے اکھاڑنے
آتی تھیں۔ ہم سب کو جلا کر بھسم کرنے آئی تھیں۔ دیوتا کہتے تھے کہ مہاراج
کا فرزند فن کر دیں گے... میں نے بڑی مشکل سے انہیں راضی کیا۔ انہوں
نے کہا ہے کہ ایک نئی (رقاصہ) کی قربانی دو۔ ان کے اشارے پر میں نے قصہ
کا انتخاب کر لیا ہے۔“

”کون ہے وہ؟“

”نندیا“

”نہیں۔“ مہاراج راجا جیا پال نے کہا۔ ”پنڈت جی مہاراج! میں نندیا کی

اپنے درمیان کیے رکھا۔ اُس نے کہا۔ ”اگر یہ دھرتی کا اڑدہ ہو تو میں
اسے قابو میں لے لوں گا لیکن مہاراج! یہ دیوتا ہے۔“ پنڈت نے اسے
کچھ بتا کر کہا۔ ”یہ پڑھتے رہیں۔ ہری کرشن آپ سے کوئی بہت بڑا کام کرنا
چاہتے ہیں۔“

مہاراج اور اُس کے بیٹے پھل پال نے وہی پڑھنا شروع کر دیا جو پنڈت
نے بتایا تھا۔ پنڈت نے مشعل کا ڈنڈہ پکڑے ہوئے شعلہ آگے کر رکھا تھا
اس لیے اڑدہ جو بہت آہستہ آہستہ اندر آ رہا تھا کھنڈلی مارنے لگا اور ڈرک
کر اکٹھا ہو گیا۔ وہ سر کو اٹھاتا اور ادھر ادھر دیکھتا تھا۔ پنڈت نے پھل پال
سے کہا کہ اندر کے غار میں رتہ ہو گا وہ لے آؤ۔

پھل پال نے تلاش کر کے رستے کا ایک لمبا ٹکڑا پنڈت کے ہاتھ میں
دے دیا۔ پنڈت نے مشعل پھل پال کو دے کر اُسے کہا کہ اڑدہ کے آگے کیے
رکھے۔ اُس نے رستے کا پھندا بنالیا۔ اڑدہ اپنی آنکھوں کے آگے شعلہ کی دھج
سے کچھ دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اُس نے ایک بار سر اٹھایا تو پنڈت نے پھندا پھینکا
جو اُس کے سر سے سرک کر گردن پر چلا گیا۔ پنڈت نے رتہ کھینچا تو اڑدہ
کا منہ کھل گیا اور اُس کا اتنا لمبا جسم ترپنے لگا۔ پنڈت مچھل کر اُس پر بیٹھ گیا
اور رتہ اس کے گرد اس طرح لپیٹ کر کس دیا کہ وہ جے بس ہو گیا۔
بارش کا زور ٹھٹھنے لگا تھا۔ پنڈت نے مہاراج راجا جیا پال کو اڑدہ سے
بہت ڈرایا۔ مہاراج پر خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ پنڈت نے اُسے کہا کہ وہ اب
غار میں ہی آرام سے سو جائے۔

دوسرے دن مہاراج کی آنکھ اُس وقت کھلی جب سورج بہت اُپر اُٹ گیا تھا۔
اُس نے غار سے دیکھا۔ وہاں نہ پنڈت تھا نہ اڑدہ۔ پھل پال بھی نہیں تھا۔
وہ باہر نکلا۔ باہر کی دنیا بدل ہوئی تھی۔ سیلاب گزر گیا تھا۔ نیچے کھڑے کئے

قربانی نہیں دوں گا۔“

”آپ غزنی کے سلطان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔“ رانی نے خشکیوں بھرے لہجے میں کہا۔ ”کیا آپ دیوتاؤں کا مقابلہ کر سکتے ہیں؟ سنڈیا کی قربانی دی جائے گی۔“

”تم چپ رہو۔“ مہاراج نے گرج کر کہا۔

”حتی دیوتا نہیں ہو سکتا۔“ رانی نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ ”دیوتا ہی ہو سکتا ہے۔ مجھے دیوتاؤں کا حکم ماننا ہے، آپ کا نہیں۔“

”پتا مہاراج!“ راجپال کے بیٹے نے جو قریب ہی کھڑا تھا، کہا۔ ”مجھے تلوار کا دھنی آپ ہی نے بنایا تھا۔ مجھے مجبور نہ کریں کہ ایک بیٹے کی تلوار اپنے باپ کا سر تن سے جدا کر دے۔ کرنی پٹوت اپنا وطن اور اپنا مذہب اپنے باپ پر قربان نہیں کر سکتا، نہ جی مہاراج جو کہتے ہیں وہی ہوگا.....“

پتا مہاراج! مجھے معلوم ہے کہ آپ نے اپنا دھرم چھوڑ نہیں دیا لیکن آپ نے غزنی کے سلطان کو اپنے دماغ پر اور اپنے دل پر سوار کر لیا ہے۔“

مہاراج راجپال نے جب اپنی رانی اور اپنے بیٹے کا رویہ دیکھا تو وہ دب گیا۔ وہ کچھ بھی نہ بولا۔ اس نے پنڈت سے یہ پوچھنے کی بھی جرأت نہ کی کہ دیوتاؤں نے صرف اُسی کو تباہ کرنے کا تہیہ کیوں کر رکھا ہے۔ مسہرا کر ج.ج سے زیادہ مقدس جگہ تھی۔ وہاں کرشن مہاراج نے جنم لیا تھا، شکر کا منہ بھی ہندوؤں کی بہت بڑی عبادت گاہ تھی۔ وہاں گھنٹیل انکھوں اور بھنجوں کی بجائے اذانیں گونج رہی ہیں۔ دیوتاؤں نے وہاں کے راجوں مہاراجوں کو آزدما بن کر نہیں ڈرایا تھا۔

مہاراج نے دیکھا کہ اُس کی رانی اور اُس کے بیٹے پر دیوتاؤں کا خوف طاری ہو گیا ہے تو وہ کچھ کہنے بغیر اُس غار میں چلا گیا جس میں اُس نے فرزند رکھوایا تھا۔

”یہ ہے ہندوؤں کا مذہب۔“ قنوج کے بڑے مندر کے سامنے ایک

آواز گرج رہی تھی۔

یہ آواز اُس خطیب کی تھی جو غزنی سے سلطان محمود غزنوی کے ساتھ آیا تھا۔ غزنی کی فوج کے ساتھ چند ایک امام بھی ہوا کرتے تھے۔ جتنی فوج ایک جگہ اکٹھی ہو وہ نماز باجماعت پڑھا کرتی تھی۔ فرصت کے وقت امام اپنے اپنے دستوں کا ایساں اور حوصلہ برقرار رکھنے کے لیے دغلا سنایا کرتے تھے۔

غزنی کا خطیب قنوج کے بڑے مندر کے چوتھے پر کھڑا تھا۔ اُس کے ارد گرد نوٹے ہوئے بٹوں کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے سامنے غزنی کی فوج کھڑی تھی۔ اس کے پیچھے قنوج کے جنگی قیدی کھڑے تھے۔

”یہ ہے ہندوؤں کا مذہب۔“ وہ بلند آواز سے کہہ رہا تھا۔ ”دیکھ لو ان کے خداؤں کے ٹکڑے تمہارے قدموں میں پڑے ہیں۔ خدا ایک ہے۔ دھرم لاشریک ہے۔ تم یہاں کوئی ملک فتح کرنے کے لیے اور یہاں لوٹ مار کرنے کے لیے نہیں آئے۔ تم یہاں ایک باطل مذہب کی بیخ کنی کے لیے آئے ہو۔ تم سوال پوچھنا چاہو گے کہ ہم نے ہندوستان کا انتخاب کیوں کیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ سرزمینِ عرب کا ایک مجاہد محمد بن قاسم ایک مسلمان لڑکے

کی پکار پر یہاں آیا تھا۔ اُس نے یہاں ایک بڑے جابر اور ظالم راجہ کو شکست دی لیکن یہ لڑخوان تہر اور دہشت بن کر نہیں آیا تھا۔ اُس نے ثابت کر دیا کہ مسلمان کی تلوار چٹانوں کو کاٹ سکتی ہے اور مسلمان کا سینہ سلوک پتھر کو موم کر سکتا ہے....“

”محمد بن قاسم نے یہاں کے پتھروں کو موم کر دیا اور یہاں کے بت پستے آپ ٹوٹے تھے۔ ہندو جوت درجوت اسلام قبول کرنے لگے۔ شمال مغربی ہندوستان اللہ اور رسول کے نور سے متور ہو گیا اور یہ مقدس روشنی سارے ہندوستان

میں پھیلنے لگی مگر حالات نے ایسا بٹا کھیا کہ مجاہد کو محرم بنا دیا گیا۔ محمد بن قاسم ایک ناہنجی زلیخہ کے قمر کا نشان بن گیا۔ ہندوستان سے وہ گیا تو ہندوؤں کے ہاتھ مذہب نے پھر سراٹھایا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مسجدیں مندروں کی جگہ لیں اور

ہندو نے دیا کلادی اور دہشت گردی سے مسلمانوں کا جینا علم کر دیا....“

”غزنی کے مجاہد! تم صرف غزنی کے پرچم کے نہیں اسلام کے علمبردار ہو یہ
خط جو دلا اسلام بن گیا کھائے خاند بن گیا۔ حق پر باطل غالب آنے لگا۔ اس
باطل کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ قوم جو ہندو کھلائی ہے، سانپوں کی نسل سے ہے۔
اس کی خصلتیں زہریلے سانپوں سے ملتی ہیں اور یہ قوم سانپوں کی بیماری ہے۔
اس کے ہاں خدائے وحدہ لا شریک کا کوئی تصور نہیں رہا بے گنگا اور جہنا
کو تم نے روندنا ہے اور اسے بار بار عبور کیا ہے، انہیں بھی ہندو اپنے دیوتا کہتے
ہیں۔ ان دیوتاؤں کے غلیظ پانی کو مقدس سمجھتے ہیں اور اس کی عبادت کرتے
ہیں۔ اس میں سنا کر کہتے ہیں کہ گناہ دھل گئے ہیں۔ کجی چلتی اور کرکنتی ہے تو
اسے دیوتاؤں کا قہر کہتے ہیں اور مندروں کی گھنٹیاں بجنے لگتی ہیں۔ اژدہا کو
دیکھ لیں تو اسے دیوتا کہتے ہیں اور اس کی پوجا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ درمے معلوم
ہوں اور نوجوان لڑکیوں کی قربانی دیتے اور ان کے خون سے ان بتوں کے
پاؤں دھو تے ہیں۔ کیا انسانی عقل اس درندگی کو نیکی کہہ سکتی ہے؟ اسے ستم
عبادت کہہ سکتے ہو؟ ...

”اسلام کے پاسبان! تم یہاں ہندوؤں کی اس ریاکاری کا قلع قمع کرنے آئے
ہو۔ اگر تم نے اس مذہب کو جڑوں سے نہ اکھاڑ پھینکا تو یہ زمین ہمیشہ کے لیے
مسلمانوں کے خون کی پیاسی رہے گی۔ یہ قوم جو چند ایک توہمات کو اور اپنے
بے مینا عقیدوں اور رسوم کو مذہب کہتی ہے، مسلمانوں کی جڑیں کھوکھلی کرتی ہے
گی۔ یہ کوئی مذہب نہیں۔ ان لوگوں کے ہندوؤں نے ان پر خوف طاری کر کے
اپنی فریب کاری کو مذہب کا نام دے رکھا ہے۔ اگر ان کا مذہب سچا ہے
تو ان کے الٰہ خداؤں سے جو متاثرے قدموں میں پڑے ہیں، کمزور کم ہمتی سے اپنی
توہین کا انتقام لیں۔ رات جو گزرتی ہے بجلی کے دھماکوں سے کانپ رہی تھی کیا
تم اطمینان کی غیند نہیں سوئے رہے؟ کیا گذشتہ رات کی طوفانی بارش نے تمہیں
ذرا سا بھی پریشان کیا تھا؟ ... نہیں بجلیاں اور طوفان کسی مسلمان کو نہیں ڈرا
سکے۔ مگر تم رات کو ہندوؤں کو دیکھتے۔ وہ ساری رات ہاتھ جوڑ کر، خوف سے

کا پٹے ہری رام ہری کرشن کا ورد کرتے رہتے تھے... حق و صداقت اور
ایمان تہذیبی قوت ہے۔ اس کے سامنے کوئی قلعہ کھڑا نہیں رہ سکتا۔ تیار
خون کے جو قطرے اس زمین پر گر گئے وہ جھل و لالہ کی صورت میں عین
گئے اور یہ زمین اللہ کے نور سے گل رنگ ہو جائے گی۔“

قنوج کی فتح کا دھماکہ ڈیڑھ سو میل دور کالنجی میں اور اتنی ہی دور گوالیار میں
بھی سانی دھند قنوج سے بھاگے ہوئے کچھ لوگ کالنجی چاہیچھ اور وہاں یہ خبر
جنگ کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ قنوج پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا ہے اور وہاں
کا بہار راج لاپتہ ہے۔ کالنجی کا راج گنڈہ ایک مدت سے ہی ایک خبر سن رہا تھا
کہ غزنی کے مسلمانوں نے حملہ کیا ہے اور فلاں راج بھاگ گیا ہے یا اُس نے
ہتھیار ڈال کر سلطان محمود کی اطاعت قبول کر لی ہے اور وہ غزنی کا باجگزار
ہو گیا ہے۔ راج گنڈہ سلطان محمود کی پیشقدمی پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اب
سلطان اُس کے دعوازے پر آن پہنچا تھا۔ ڈیڑھ سو میل کوئی فاصلہ نہیں تھا۔
راج گنڈہ نے اُسی دقت گوالیار کو روانگی کا حکم دے دیا۔

وہ جب گوالیار پہنچا تو اُسے پتہ چلا کہ راج ارجن کو قنوج کے سقوط
کی اطلاع مل چکی ہے۔ وہ پریشان بھی تھا اور بھڑکا ہوا بھی مگر وہ یہ تسلیم
کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ مہاراج قنوج بھاگ گیا ہے، حالانکہ بتانے
والوں نے یہی بتایا تھا کہ جب قنوج کا محاصرہ ہوا تو قلعے میں فوج بہت تھوڑی
تھی اور مہاراجے کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ کوئی مقابلہ بھی نہ ہوا۔ مسلمان شہر
میں داخل ہوئے اور شہر اور مندروں کی تباہی شروع ہو گئی۔

کالنجی اور گوالیار کے مہاراجوں نے مل کر مشترکہ منصوبہ بنایا کہ سلطان محمود
پر جا سوسوں کے ذریعے نظر رکھی جائے کہ وہ آگے بڑھتا ہے یا قنوج میں
رہتا ہے یا واپس چلا جاتا ہے۔ اگر وہ قنوج میں رکتا ہے تو اُس پر دہلی
حملہ کیا جائے اور اس حملے میں لاہور کے راج بھیم پال منڈ کی فوج کو بھی شامل
کے جائے۔

مہاراجہ کالجی بھی گوالیار میں ہی تھا کہ قنوج کے راج دربار کا ایک اہل رہتے
کا آری کالجی کے راستے گوالیار پہنچا۔ کالجی میں اُسے بتایا گیا تھا کہ مہاراجہ گندہ گولڈ
میں ہے۔ اس آدمی نے دونوں مہاراجوں کو بتایا کہ مہاراجہ قنوج محاصرے
سے پہلے ہی کہیں غائب ہو گیا تھا۔ غزنی کا سلطان محمود آیا تو اُس نے خزانہ
کھلوایا، خزانہ باطل خال تھا۔ مہاراجہ کے گھر کے ہیرے جواہرات اور زیورات
وغیرہ بھی غائب تھے۔ قلعے میں قنوج بھی پوری نہیں تھی۔
”اس کا مطلب یہ ہوا کہ مہاراجہ راجپال دشمن کو دیکھے بغیر غائب ہو گیا
تھا۔ مہاراجہ گندہ نے کہا۔“ اور وہ قنوج کو بھی ساتھ لے گیا تھا۔“
”کیا ہندو جاتی اس کا یہ گناہ معاف کر دے گی؟“ راجہ ارجن نے
غضباً کہا ”آواز میں کہا۔“ کیا یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ گیا کہاں ہے؟“
”یہ معلوم نہیں ہو سکا۔“ اس آدمی نے جواب دیا۔“ اور دوسری خبر یہ
ہے کہ سلطان محمود غزنی چلا گیا ہے۔“

”اور اُس کی قنوج؟“
”کچھ ساتھ لے گیا ہے کچھ قنوج میں چھوڑ گیا ہے۔“

”کہیں ایسا تو نہیں کہ مہاراجہ راجپال نے سلطان محمود کے ساتھ کوئی ہتھیار
معاوضہ کر لیا ہو؟“ راجہ ارجن نے پوچھا۔ ”اور سلطان کو خوش کرنے کے لیے
اپنی قنوج جسے وہ اپنے ساتھ لے گیا ہے ضرورت کے وقت سلطان کو دے
دے؟“

”ہمیں سوچ کچھ کر قدم اٹھانا پڑے گا۔“ مہاراجہ گندہ نے کہا۔ ”راجپال
کو ہم سارے ہندوستان کی عزت کا رکھوالا سمجھتے تھے مگر وہ بزدل نکلا۔ مسکرا
مہابن، بلند شہر اور رنج کی فوجیں ختم ہو چکی ہیں۔ لاہور کے راجہ بھی پال نڈر پر
نظر اٹھتی ہے مگر وہ غزنی والوں کا بھڑا رہے۔ وہ ہمارا ساتھ نہیں دے گا۔“
”مگر ہم یہاں بیٹھے تاشہ تو نہیں دیکھ سکتے؟“ راجہ ارجن نے کہا۔ ”اپنے
دیس اور اپنے مذہب کی خاطر ہمیں اپنا سب کچھ داؤ پر لگانا ہو گا۔ مسلمانوں

کو ہم اتنی آسانی سے ہندوستان کی حکمرانی نہیں لینے دیں گے۔ مسلمانوں کی
حکمرانی کا مطلب یہ ہو گا کہ صرف ہمیں ہی نہیں، ہمارے مذہب کو بھی ختم کر دیا
جائے گا۔“

مؤرخین نے جن میں گروہری، ابن الاثیر، سمتھ اور فرشتہ قابل ذکر ہیں،
لکھا ہے کہ کالجی اور گوالیار کے مہاراجوں نے سلطان محمود کے خلاف متحدہ محاذ
بنالیا اور ان کے درمیان طے پایا کہ سلوک کیا جائے کہ مہاراجہ قنوج کہاں ہے
اور راجہ بھی پال مڈر کے ہاں اچھی بھیجا جائے کہ وہ سلطان محمود کے خلاف لڑنے
کے لیے تیار ہو جائے تاکہ اُسے فیصلہ کن شکست دی جاسکے۔

سلطان محمود غزنی چلا گیا اور قنوج کا قلعہ اپنے ایک سالار ابوالقدر کے حوالے
کر گیا تھا۔ غزنی کی تاریخ میں دوسرا لڑوں کو زیادہ شہرت ملی ہے۔ ایک
ابو عبد اللہ بن محمد الطائی تھا اور دوسرا ارسلان جاذب۔ ابوالقدر کا ذکر بہت کم آیا
ہے لیکن قنوج میں اُس نے ایسے نظامی انتظامات کئے اور انتظامیہ کا ایسا
دھماکہ بنایا کہ قنوج کو اس نے محفوظ کر دیا تھا۔

مہاراجہ قنوج کا سرانجام لگانا کسی نہیں تھا۔ اُسے پنڈت نے از دہ سے
ڈرا دیا تھا اور اُس پر اس لیے بھی خاموشی طاری ہو گئی تھی کہ اُس کی پسندیدہ
رتا صد کو انسانی قربانی کے لیے ملتی۔ کر لیا گیا تھا۔ اُس کا بیٹا کچھن پال اُس
کے پاس غلام میں جا بیٹھا اور کچھن کا کہ اُسے باری کو راجدھانی بنانے کی اجازت
دی جائے۔ وہاں وہ تیار می کر کے سلطان محمود کو قنوج سے نکلے گا اور شکست
کا انتقام لے گا۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ وہ لاہور، کالجی اور گوالیار کے مہاراجوں کو
بھی اپنے ساتھ ملا لے گا۔

”کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ سلطان محمود ہمیں نئی راجدھانی آباد کرنے دے گا؟“
راجپال نے کہا۔ ”اُس کے جاسوس دُور دُور تک پہنچے ہوئے ہیں۔ اُسے جو بھی
ہتھیار ملے گا ہم باری میں اپنی قنوج تیار کر رہے ہیں، وہ ہم پر ٹوٹ پڑے گا۔“

”تو کیا ہم جنگوں میں چھیپے نہیں گئے؟“ پھمن پال نے پوچھا۔
 ”میں نے ایک محفوظ طریقہ سوچا ہے۔“ راجا پال نے کہا۔ ”میں قنوج سلطان کو
 کے پاس چلا جاتا ہوں۔ اُسے اس پر راضی کر لوں گا کہ مجھ سے تناواں لے لے اور
 میں اس کا ہتھیار بھی رہوں گا اور وہ مجھے باری کو راجہ صافی بنانے اور قنوج
 تیار کرنے کی اجازت دے دے۔ میں اس کے ساتھ معاملہ کروں گا کہ اس
 کے خلاف کبھی نہیں لڑوں گا اور اسے بوقت ضرورت قنوج بھی دوں گا۔“
 ”نہیں۔“ پھمن پال نے کہا۔ ”آپ کا جانا ٹھیک نہیں۔ آپ ہر پور پور
 کرنا کہ سلطان محمود آپ سے خزانہ مانگے گا۔ اگر آپ نہیں دیں گے تو آپ کو قتل
 کر دے گا۔۔۔ اگر ایسا نہ ہو تو بھی میں آپ کو نہیں جانے دوں گا کیونکہ ہم
 میں سے کسی کو آپ پر بھروسہ نہیں۔ آپ کے دامغ پر غزنی کا سلطان اتنا زیادہ
 سوار ہو گیا ہے کہ آپ اپنے مذہب سے کبھی منحرف ہو گئے ہیں۔“
 ”تو کیا میں تم سب کا قیدی ہو گیا ہوں؟“ ہماراج نے پوچھا۔
 ”پنڈت جی ہماراج کہتے ہیں کہ آپ پر کسی شیطانی روح کا سایہ پڑ گیا ہے۔“
 — اُس کے بیٹے پھمن پال نے کہا۔ ”یہ سایہ جنگ کی جان کی قربانی سے
 ہٹ جائے گا۔ پنڈت جی ہماراج کہتے ہیں کہ جھکوان جب کسی پر قہر برسانے
 پر آتے ہیں تو اسے سب سے پہلے اپنے مذہب سے گمراہ کرتے ہیں۔“
 ”مذہب۔۔۔ مذہب۔۔۔ مذہب۔“ راجا پال نے طنز پر کہا۔ ”میں مذہب
 سے تنگ آ گیا ہوں۔ میں کسی کا قیدی نہیں۔ تم جاؤ۔ باری چلے جاؤ۔ راجہ صافی
 آباد کرو۔ میں تمہارا باب ہوں۔ تم میرے جانشین ہو۔ میں تمہاری حفاظت
 کے لیے جو بہتر کھوں گا کروں گا۔“

پنڈت نے اپنا خیمہ اب دُور نصب کر لیا تھا۔ ہماراج کی طرح اس کا خیمہ
 تین خیموں پر مشتمل تھا۔ ایک کو اُس نے عبادت گاہ بنا رکھا تھا۔ اس کے نیچے
 کوئی نہیں جاسکتا تھا۔ اُس نے جب رقصہ نندیا کو اپنے ہاں بلایا تو وہ حیران

ہوئی کہ پنڈت نے اُسے کیوں بلایا ہے۔ وہ کسی رقصہ کے ساتھ بات تک
 نہیں کیا کرتا تھا۔ نندیا اُس کے نیچے میں چلی گئی۔

”نندیا!۔“ پنڈت نے کہا۔ ”تم باب کی چٹی پھرتی مٹاؤ۔ تم سر جاؤ گی
 تو لوٹری یا گینڈی کے روپ میں دوسرا خیمہ لوگ۔ تمہارا وہ جسم دکھوں سے بھرا ہو گا۔
 تمہاری رقص بھٹکتی اور روتی تب سے گی۔ تم پہلے خیمہ کو یاد کر کر کے بہت اذیت
 اٹھاؤ گی، لیکن ہر ہر ہوا تو تم پر معلوم نہیں کیوں بہرمان ہو گئے ہیں۔ انہوں نے
 تمہیں اپنی جتنی بنانے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ دیوتا کی خواہش حکم ہوتا ہے
 نندیا! تم اس جیون کو نہیں چھوڑنا چاہو گی لیکن تم خوش ہو جاؤ کہ تم آکاش کی
 رانی بنو گی۔“

”وہ کس طرح ہماراج؟“

”ہم نہیں دیوتا کے قدموں میں قربان کر رہے ہیں۔“ پنڈت نے کہا۔
 ”چاند کی بارھویں رات دیوتا ہمیں لینے آئیں گے۔ تمہارا خون اس زمین پر بہہ
 جائے گا کیونکہ یہ خون پاک نہیں۔“

”میں سمجھ گئی ہوں ہماراج!۔“ نندیا نے گھبرا کر کہا۔ ”آپ میری گردن
 کاٹ دیں گے۔۔۔۔۔ نہیں ہماراج! میں یہ موت نہیں مرنا چاہتی۔“
 ”تمہیں مرنا ہو گا نندیا!۔“ پنڈت نے کہا۔ ”اپنے مذہب اور اپنے
 ہماراج کی خاطر تمہیں جان دینی ہو گی۔“

نوجوان رقصہ نے بھاگ جانے کے لیے ادھر ادھر دیکھا۔ پنڈت نے
 اُسے تسلی دلا کر دیا اور کہا۔ ”تم دیوتاؤں کی خواہش کو ٹھکراؤ گی تو تمہارا یہ حسین چہرہ
 جھڑیوں سے بھر جائے گا۔ آنکھیں سفید ہو جائیں گی اور کمر ٹھک جائے گی۔ تم
 ہماراج کے قابل نہیں رہو گی۔ وہ تمہیں جنگل میں چھوڑ جائیں گے۔۔۔ دیوتا آگے
 ہیں۔ آؤ تمہیں دکھاؤں۔“

وہ اُسے دوسرے کمرے میں لے گیا جو خیمہ ہی تھا۔ اُس نے ایک جگہ
 خشک گھاس ڈال رکھی تھی۔ کڑی سے گھاس ہٹائی تو ایک گڑھا نظر آیا۔ پنڈت

نے نندیا کو آگے کر کے گرٹھا دکھایا۔ اس میں ایک اڑدہ گندلی مارے ہوئے تھا۔ اس پر رتسہ لپٹا ہوا تھا۔ نندیا کی دلی دلی سی چیخ نکلی گئی۔

”یہ میں دیتا جو ہمارے یہاں ہیں۔“

”کیا آپ مجھے اس گڑھے میں پھینک دیں گے؟“ نندیا نے کانپتی ہوا آواز میں کہا۔

پنڈت نے ایک بھول رقاصہ کی ناک سے لگا دیا اور کہا کہ اسے سونگھو۔ یہ مہادیو کا تختہ ہے۔ رقاصہ نے پھول سونگھا اور اُس پر مٹو دلی طاری ہو گئی۔ ذرا سی دیر بعد وہ ڈولنے لگی۔ پنڈت نے اُسے حتمی لیا اور دوسرے خیمے میں جا کر لٹا دیا، پھر اُس نے جا کر اڑدہ پر گھاس بکھیر کر اُسے چھپا دیا۔

دو تین راتیں گزریں۔ رات کے اندھیرے میں کوئی آدمی سایہ بن کر بیٹے پانڈل خیموں کے ساتھ ساتھ چلتا اور کرتا تھا۔ ایک رات وہ پنڈت کے خیمے کے ساتھ جا کھڑا ہوا اور بیٹھ کر کان خیمے کے ساتھ لگا دیئے۔ وہ خیمے کے اندر گد رینگتا رہا اور رینگتا ہوا پرے چلا گیا۔ اگلی رات وہ مہاراجہ کے خیموں کے قریب چلا گیا۔ لٹکار سائی دی ”کون ہے؟“ یہ سایہ ساد میں سے غائب ہو گیا۔ اندھیرے میں سنسناتا ہوا ایک پیر کیا جو اُس کے قریب سے گذر کر زمین میں جا لگا۔ وہ چوبالوں کی طرح چھالوں میں چلا گیا جہاں سے گیڈ کی آوازیں سنائی دیں۔ محاذوں نے کہا ”گیڈ ہے؟“ انہوں نے تلاش ترک کر دی۔

چند روز بعد مہاراجہ راجپال نے دو آدمی بلائے۔ دونوں اعلیٰ حکام تھے اور اُس کے مستند۔ انہوں نے ہر حال میں مہاراجہ کا ساتھ دیا تھا۔ اب بھی انہوں نے اُسے یقین دلایا تھا کہ ہر عسبیت میں اور اُس کے ہر فیصلے میں اُس کا ساتھ دیں گے۔ اُس نے انہیں کہا کہ وہ قنوج جا کر سلطان محمود کی اطاعت قبول کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر وہ اپنا مستقبل نہیں بنا سکتا۔ مہاراجہ جگر زربن کر باری کو آباد کرنا چاہتا تھا لیکن پنڈت اس کی رانی

اور اس کا بیٹا اس فیصلے کے سخت خلاف تھے۔

مہاراجہ نے اپنا شاندار لباس اتار کر بائبل معمولی سے کپڑے پہن لیے۔ ایسا ہی لباس اپنے دونوں ساتھیوں کو پہنایا۔ سر اور چہرے پر گرد ڈال لیا۔ وہ تینوں جب یہ بھیس بدل رہے تھے، اُس وقت پنڈت اُس کے خیمے میں آیا لیکن اُسے کوئی دیکھ نہ سکا۔ اُس نے تینوں کو بھیس بدلتے دیکھا تو اُسے شک ہوا۔ وہ وہیں سے واپس چلا گیا۔ مہاراجہ کا خیمہ سب سے الگ تھلک اور دور ہٹا ہوا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اُسے کسی نے نہیں دیکھا۔ وہ تینوں گھوڑوں پر سوار ہوئے اور دوسری طرف جدھر ویران تھا، نکل گئے۔ قنوج کی طرف جانے کے لیے جنگل میں سے نکلنے کا ایک ہی راستہ تھا جو چٹانوں کے درمیان سے گذرتا تھا۔ وہاں گھنے پودے اور درخت تھے۔ تینوں سوار ایک چٹان کی اوٹ میں جا کر خیمہ گاہ سے اوجھل ہو گئے اور طینان سے چلے گئے۔ وہ جب دو چٹانوں کے درمیان سے گذر رہے تھے تو ہماراجہ کا گھوڑا جو آگے جا رہا تھا، ٹک گیا اور آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ مہاراجہ کے ایک ساتھی نے کہا کہ گھوڑے نے سانپ دیکھ لیا ہے۔ اتنے میں دوسرے دو گھوڑے بھی ٹک کر کانپنے لگے۔ گھوڑا اگر سانپ کو دیکھ لے تو بے لگا ہو کر بھاگ اٹھتا ہے یا ایک جگہ رک کر کانپنے لگتا ہے۔ چھالوں میں سے ایک گوجدار اور بھاری سی آواز سنائی دی۔ واپس جاؤ۔ دل کے ارادے دل میں مار دو۔ واپس جاؤ۔ جہاں جا رہے ہو ملن و ملت کی موت ہے۔“ یہ آواز لگ کر آتی تھی اور اس کے ساتھ وہی سی آواز میں گھنٹیاں بجاتی تھیں۔ ان کے بچنے کا خاص انداز تھا جس سے ہر ہندو واقف تھا۔ ایسی گھنٹیاں مندروں میں بجا کرتی ہیں۔

”یہ آواز کسی انسان کی معلوم نہیں ہوئی۔“ مہاراجہ کے ایک ساتھی نے کہا۔ اچانک ایک گھنے پودے میں سے ایک اڑدہ کا سر نظر آیا۔ اڑدہ آہستہ آہستہ باہر آ کر ہٹا۔ تینوں گھوڑے بد کے اور پیچھے کو بھاگ لکھنے کی بجائے

وائیں بائیں ہو کر سر پٹ دوڑ پڑے اور بکھر گئے۔ تھوڑے بے لگام ہو گئے تھے تینوں ماہر سوار تھے۔ انہوں نے دماغ حاضر رکھے اور گھوڑوں کو تھک جانے تک دوڑنے دیا۔

اُن کے چلے جانے کے بعد اژدہا ایک اور جھاڑی میں چلا گیا۔ ایک گڑھے میں سے جس پر برہری جھاڑیاں اور گھاس تھی، پنڈت نے سر نکالا۔ ادھر ادھر دیکھ کر وہ اوپر اُگیا اور کھڑا ہو گیا۔ اُس نے ہاتھ اپنے ماتھے پر مارا جیسے اُسے تینوں سوار نکل جانے کا افسوس ہوا ہو۔ اُس نے آسمان کی طرف دیکھا اور بڑی کھڑکتا۔

کہیں سے ایک آدمی اُس کے سامنے آگیا۔ پنڈت اسے پہچانتا تھا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر عیاض تھا۔ اُس نے نیام سے تلوار نکال لی اور بولے۔ ”ننڈیا کہاں ہے؟“

”تم یہاں کیا لینے آئے ہو؟“ پنڈت نے اُسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”چلے جاؤ یہاں سے ورنہ مہاراجہ سے کہہ کر قتل کرا دوں گا۔“

”تمہاری اور مہاراجہ کی جانیں ہمارے قبضے میں ہیں۔“ محافظ نے کہا۔

”میں پوچھتا ہوں تم نے ننڈیا کو کہاں چھپا رکھا ہے؟ ... میں اس کی قربانی نہیں دینے دوں گا۔ تم یہاں سے ذمہ نہیں جاسکو گے پنڈت!“

پنڈت اُسے دیوتاؤں کے قہر سے ڈرانے لگا۔ قریب کی ایک گھنی جھاڑی سے جو پنڈت کے پیچھے تھی۔ اژدہا نے سر نکالا اور آہستہ آہستہ باہر آنے لگا۔ ادھیڑ عمر عیاض نے دیکھا مگر پنڈت کو خبردار نہ کیا۔ اژدہا نے چھپٹ کر پنڈت کی ران منہ میں لے لی پنڈت نے چیخ ماری۔ اژدہا نے اُسے اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا اژدہا مگر چمکے کی طرح شکار کو چھوٹا نہیں سالم نگتا ہے اور اس میں بہت وقت لگتا ہے۔ پنڈت نے چیخ چیخ کر محافظ سے کہا ”اُسے کاٹ دو۔ اسے تلوار سے کاٹ دو۔“

”ننڈیا دیوتا ہے پنڈت جی مہاراج!“ محافظ نے کہا ”میں جانتا ہوں یہ کب سے تمہاری قید میں ہے۔ میں مہاراجہ کا وفادار ہوں، تمہارا نہیں۔ مجھے سب معلوم ہے تمہارا دیوتا ہمارے مہاراجہ کو روک نہیں سکا۔“

”مجھے اس سے چھڑاؤ... آگے آؤ۔“ پنڈت چلا رہا تھا۔

”ننڈیا کہاں ہے؟“

”بتا دوں گا۔“ پنڈت نے درو سے کراہتے ہوئے کہا۔ ”اسے کاٹ دو۔“

”ننڈیا کہاں ہے؟“ محافظ نے کہا ”وہ تمہارے لیے ناچنے والی ایک بے سنی لڑکی ہے لیکن میں اسے اپنی بیٹی سمجھتا ہوں۔ درو تیر لڑکی ہے جسے میرے ماں باپ نے پالا پوسا اور مہاراجہ کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ مجھے اس بچی کے ساتھ اتنا پیار تھا کہ میں اس کی خاطر مہاراجہ کے پاس آگیا۔ میں نے مہاراجہ کو تیر اندازی اور تیغ زنی کے جوہر دکھائے تو اس نے مجھے اپنے پاس رکھ لیا۔ میں مہاراجہ کا کم اور ننڈیا کا محافظ زیادہ ہوں۔“

”میرے بھیسے سے دو سو قدم پور بھ کی طرف چلے جانا۔“ پنڈت نے کہا۔ ”وہاں دو ٹیلوں کے درمیان جاؤ گے تو دائیں ٹیلے میں ایک سنگاف دیکھو گے۔ اس میں چلے جانا۔ آگے گف ہے۔ بہت بھی ہونی اچک ہے۔ تم بھی وہیں رہنا چاہو گے۔ تمہیں ننڈیا وہیں ملے گی... آگے آؤ بد بخت! مجھے اس سے چھڑاؤ۔“

”تم اپنی ریاکاری کا شکار ہو رہے ہو۔“ محافظ نے کہا ”تمہاری اپنی فریب کاریاں تمہیں نگل رہی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ اژدہا ہے دیوتا نہیں ہے۔“

”محافظ نے تہقہہ لگایا اور تلوار نیام میں ڈال کر وہاں سے اُس سمت دوڑ پڑا جو اسے پنڈت نے بتائی تھی۔“

اژدہا نے پنڈت کو زمین پر بار بار پٹخا اور اس کی ران چھوڑ کر اس کا سر اپنے منہ میں لے لیا۔ پنڈت بے ہوش ہو چکا تھا۔ اژدہا اُسے اچھل اچھال کر

نکھنے لگا۔

اودھر عمری حفظ نے گھوڑا کہیں دوڑا کر رکھا تھا۔ وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور اُس جگہ پہنچا جو اُسے پنڈت نے بنائی تھی۔ نشانیاں بڑی صاف تھیں۔ وہ نیلے کے شرکاف میں داخل ہو گیا۔ اُس کے خاصی کھلی گھٹکتی جس کے فرش پر نعل جیسا کپڑا بچھا تھا۔ کچھ مورتیاں رکھی تھیں اور لوہاں سنگ رمل تھا۔ نوجوان رفاقت نے محافظ کو یوں دیکھا جسے اُسے پہچانتی ہی نہ ہو۔ محافظ پرانی عمر کا تجربہ کار آدمی تھا۔ اُسے شک ہوا کہ نندیا کسی دوائی کے اثر میں ہے در نہ یہاں سے اکیلی کہیں نکل جاتی۔ محافظ نے نندیا کو بلایا تو وہ مسکرائی۔

محافظ نے وقت ضائع نہ کیا۔ وہ تو منہ آدمی تھا۔ اُس نے نندیا کو اٹھا کر کندھے پر ڈال لیا اور باہر لے جا کر گھوڑے پر سوار کیا۔ خود بھی سوار ہوا اور جنگل کو نکل گیا۔

ہمارا جراجیا پال کا بیٹا کھن پل اپنے باپ کو ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ پنڈت کے خیمے میں گیا۔ پنڈت دماغ نہیں تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ پنڈت نے نندیا کو کہاں بکھا ہوا ہے۔ دماغ کیا تو دماغ نندیا نہیں تھی۔ واپس خبر گاہ میں آیا تو ایک ملازم نے اُسے بتایا کہ پنڈت کو اُس نے ظان طرف جاتے دیکھا تھا۔ وہ

بہت بڑی گٹھری کو گھسیٹ کر لے جا رہا تھا۔ کھن پال اُدھر گیا۔ اُسے گٹھری گھسیٹنے کے نشان نظر آرہے تھے۔ یہ نشان اُسے دماغ تک لے گئے جہاں اژدہ پنڈت کو آدھے سے زیادہ نکل چکا تھا۔ پنڈت کل ناگیں اژدہ کے منہ سے باہر تھیں۔

کھن پال نے تلوار نکالی اور اژدہ کو دو دھتوں میں کاٹ دیا مگر پنڈت جس ٹکڑے میں آپکا تھا اس سے نہ نکل سکا۔ وہ جے جس ہو چکا تھا۔ کھن پال کا سر گیا تھا۔ کھن پال نے دیکھا کہ دماغ ایک موٹا کپڑا بچھا اور ایک رستہ بھی تھا۔ اُس نے رستے کا یہ ٹکڑا پہچان لیا۔ جس رات اژدہ غار میں آیا تھا، کھن پال وہیں تھا۔ رستے کا یہ ٹکڑا اُنسی نے پنڈت کو دیا تھا۔ اُس نے اژدہ کو بھی

پہچان لیا لیکن سمجھ نہ سکا کہ یہ قصہ کیا ہے اور ہوا کیا ہے۔

ہمارا جراجیا پال بہت دور جا کر اپنے ساتھیوں سے ملا۔ اُن کے گھوڑے بے لگام اور سرسبز دوڑ دوڑ کر ٹپل ہو گئے تھے۔ اس سے سواروں کو یہ فائدہ پہنچا کہ پورے دن کی مسافت آدھے دن میں طے ہو گئی۔ وہ قنوج کی طرف صحیح سمت پر جا رہے تھے۔

محافظ دن بھر نندیا کو نیلے پھرتا اور اُسے دوائی کے اثر سے نکلنے کی کوشش کرتا رہا۔ شام کے بعد نندیا اپنے آپ میں آنے لگی اور اُس نے اس طرح باتیں کیں جیسے خواب سے بیدار ہوئی ہو۔ پنڈت نے کسی دوائی کے ذریعے اس کے دماغ کو ماؤف کر رکھا تھا۔ اُسے اتنا ہی اچھی طرح یاد تھا کہ پنڈت نے اُسے کہا تھا کہ وہ دیوتاؤں کو راضی کرنے کے لیے اُس کی جان کی قربانی دے گا۔ باقی سب باتوں کو وہ خواب کی باتیں سمجھتی تھی۔

پنڈت خود دیوتا کا نالہ بن گیا ہے۔“ محافظ نے اُسے بتایا۔“ اُس نے ایک اژدہ کا کپڑا رکھا تھا۔ اُس سے وہ ہمارا جراجیا کا رستہ روکن چاہتا تھا گرتھا نے اُسی کو کھالیا۔“

”ہمارا جراجیا کمال ہیں؟“

”قنوج گئے ہیں۔“ محافظ نے جواب دیا ”مسلمانوں سے صلہ کریں گے۔“

”مسلمانوں سے صلہ کرنے گئے ہیں؟“ نندیا نے حیران ہو کر کہا۔

”ہاں!“ محافظ نے جواب دیا۔ ”ان کی سلامتی اسی میں ہے۔ پیری طرح

وہ بھی سمجھ گئے ہیں کہ پنڈتوں کا یہ مذہب اُن کا اپنا فریب ہے اور میدان جنگ میں کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ ہمارا جراجیا کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے مسندوں کو تباہ و برباد کر دیا ہے تو ہمارے دیوتاؤں نے اُن کا کیا بگاڑ لیا ہے؟“

”تم بھی اپنے مذہب کے خلاف ہو گئے ہو؟“ نندیا نے پوچھا۔

”ہمارا مذہب کیا ہے نندیا؟“ اُس نے جواب دیا۔ ”راجوں ہمارے ہیں۔“

”تم نہیں ہو؟ کیا کر رہے ہو؟“
 ”جو لوگ ہیروپ میں آتے ہیں انہیں اہل روپ میں لانے کا کام کرتا ہوں“
 ”نگرام نے کہا۔“ میں اب نگرام نہیں عثمان ہوں مسلمان ہو گیا ہوں۔
 آپ مجھے عذر کہہ سکتے ہیں مگر ہمارا خود ہی قوم سے غدری کر جائے تو...“
 ”میں کسی کو عذر کہنے نہیں آیا۔“ ہمارا جہ نے کہا ”غزنی کے سلطان سے
 ملنے آیا ہوں“

”سلطان غزنی جا چکا ہے“ عثمان نے کہا ”یہاں سالار الباقدر سلجوقی

ہے۔“
 ”اُس کے پاس لے چلو۔“

سالار الباقدر سلجوقی کو جب بتایا گیا کہ یہ شخص ہمارا جہ متزوج ہے تو اُس
 نے یقین نہ کیا۔ اُسے یقین دلایا گیا تو اُس نے پوچھا کہ ہمارا جہ کیوں آیا ہے؟
 ”سلطان کی اطاعت قبول کرنے آیا ہوں۔“ ہمارا جہ نے کہا۔ آپ
 چاہیں تو مجھے قید کر لیں، چاہیں تو قتل کر دیں۔“

”میں ایک ہمارا جہ کو اس جیلے میں نہیں دیکھ سکتا۔“ الباقدر سلجوقی نے
 کہا۔ ”اگر آپ کے کمرے خون آلود ہوتے ہیں اور زیادہ خوش ہوتا کہ آپ
 اپنے ملک کے لیے لڑے ہیں مگر آپ میرے پاس آگئے ہیں۔ میں آپ کا احترام
 کرتا ہوں۔“ الباقدر نے حکم دیا۔ ”ہمارا جہ کو غزنی کے امراء کا لباس پہنا
 کر لایا جائے اور ان کے ساتھیوں کو عزت سے رکھا جائے۔“

کچھ دیر بعد ہمارا جہ نہاد دھوکہ نہایت اچھی پوشاک میں الباقدر کے سامنے
 آیا۔ الباقدر نے اُس سے پوچھا کہ اس کے پاس ہے کیا جس کے بل بوتے
 پر وہ اپنے آپ کو قیدی نہیں سمجھتا اور اطاعت قبول کرے گا؟
 ”آپ کو یہاں خزانہ خالی ملا ہوگا۔“ ہمارا جہ راجا پال نے کہا ”وہ تمام

کو خوش کرنا اور اُن کی جان بچانے کے لیے اپنی جان دے دینا ہمارا مذہب
 ہے۔... مگر یہ باتیں ہمارے سوچنے کی نہیں۔ ہمیں اب یہ سوچنا ہے کہ جائیں
 کہاں... بالآخر قریب ہے۔ ڈیرھ دن کا سفر رہ گیا ہے۔ وہاں کے دیوار
 میں نہیں اور اپنے آپ کو پیش کر دیں گا۔ کسی نے قبول کر لیا تو وہیں رہیں گے۔
 نہیں تو کہیں اور پٹے چلیں گے۔“

انہوں نے وہ سات سفر میں گزاری۔ اگلے صبح وہ کالجہ کے قریب پہنچ گئے
 تھے۔ اور اُس صبح ہمارا جہ راجا پال قنوج میں داخل ہوا۔ اُس کے دونوں ساتھی
 ساتھ تھے۔ تینوں کے چلنے عام سی قسم کے مسافروں جیسے تھے۔ ہمارا جہ نے
 اپنی راجدھانی دیکھی تو اسے دھچکا سا لگا۔ شہر اچھا اچھا تھا اور بعض مکان بڑے
 ہونے لگے۔ ہمارا جہ آگے بڑھتا گیا اور بڑے مندر کے سامنے گھوڑے
 سے اُتر۔ کسی نے اُس کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی نہ دیکھا۔ وہ مندر کے
 چبوترے پر بٹھ گیا۔ مندر خاموش تھا۔ وہاں بدبو سی تھی۔ یہاں تو خوشبو
 ہوا کرتی تھی۔ اندر گیا تو مندر ویران تھا۔ نہ کوئی بت نہ مورتی۔ یہ تو اجڑی
 ہوئی سڑک تھی۔ وہ اندر ہی کمروں میں گیا۔

”میں کچھ نہیں سمجھ سکتا۔“ اُس نے جذبات سے لرزتی ہوئی آواز
 میں کہا ”میں کچھ نہیں جانتا۔ کیا یہ دیوتاؤں کا قہر ہے کہ ہم اجڑے چھڑا
 شہر اجڑا... کیا یہ میل خرم ہے؟... میں نہیں جانتا کون جھوٹا ہے اور
 کون سچا ہے۔ یہاں تو بھنبوں میں دیوتاؤں کے ساتھ میرا نام بھی لیا جاتا تھا۔“
 ”سچا وہ خدا ہے جو بھنبوں اور گھنبوں سے بے نیاز ہے۔“ اُس کے
 عقب سے آواز آئی۔

ہمارا جہ نے گھوم کے دیکھا۔ ایک آدمی اُس کی زبان بول رہا تھا۔ کیا
 قنوج کا ہمارا جہ اپنے جاہ و جلال کے اور اپنے باطل مذہب کے کھنڈات
 دیکھ رہا ہے؟... کیا ہمارا جہ عبرت حاصل کرنے آیا ہے؟
 ”اوہ، تم؟ نگرام؟“ ہمارا جہ نے اس آدمی کو پہچانے سے ہونے پوچھا

خزانہ میرے پاس ہے۔ میرے پاس باری نام کی ادب جگہ ہے اہل دہاں کچھ فوج بھی ہے۔ اگر آپ مجھے یقین دلا دیں کہ باری میں مجھے اپنی ریاست تمام کرنے دیں گے تو میں تادان بھی ادا کروں گا اور باج بھی اند میں دوستی کا سلسلہ بھی کروں گا۔

”آپ بھاگے کیوں تھے؟“ — ابو القدر نے پوچھا۔

”میں اس سوال کا جواب نہیں دوں گا۔“ ہمارا جہ نے کہا۔ ”کیونکہ یہ خوشامد ہوگی۔ میں نے اپنے دیوتاؤں کی بھی کبھی خوشامد نہیں کی۔“

”کیا آپ اسلام قبول کریں گے؟“

”میں مذہب کے نام سے بیزار ہوں۔“ ہمارا جہ نے جواب دیا۔ ”میں آپ کے سلوک سے اس قدر متاثر ہوا ہوں کہ کسی دان پیرادل مجھے کہے گا کہ اسلام قبول کر لو، لیکن ابھی آپ میری درخواست پر غور کریں۔“

”میں سلطان غزنی کے نام پر آپ کی درخواست قبول کرتا ہوں۔“

ابو القدر نے کہا۔ ”آپ اپنی نئی ریاست قائم کر لیں۔ میرے کچھ فوجی حکام باری جاکر جائزہ لیں گے کہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ تجویزی مسادہ ابھی ہو جائے گا۔ تادان اور بلج سلطان غزنی مقرر کریں گے۔ قاصد آج ہی روانہ ہو جائے گا۔“

ادھر ننڈیا اپنے محافظ کے ساتھ کالج پینچ گئی۔ محافظ نے ہمارا جہ کا الجھ کر یہ خبر سنائی کہ ہمارا جہ راجا پال غزنی کی اطاعت قبول کرنے کے لیے فوج چلا گیا ہے۔ ہمارا جہ کالج پینچ گنڈہ ٹرپ اٹھا۔ اُس نے اُس وقت راجہ اجین (گوالیار) کے نام پیغام لکھوا کر بھیج دیا جس میں لکھا کہ وہی ہو جس کا ڈر تھا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا کہ راجا پال کے قتل کا انتظام کیا جائے اور راجہ بھیم پال نڈر سے مل کر سلطان محمود کو فیصلہ کے لیے ختم کیا جائے۔

غزنی کی آبرو

۴۰۹ ہجری (۲۰-۱۱۹۱ھ) کے حج میں چند ہیسنے باقی تھے۔ حج کو جانے والوں کے قافلے

تیلد ہو رہے تھے۔ ہر علاقے کے سینکڑوں لوگ اکٹھے ہو جاتے اور گھوڑوں، خچروں اور اونٹوں پر اور پیدل قافلے کی صورت میں حج کو جلا کرتے تھے۔ ان قافلوں میں تاجر بھی شامل ہو جایا کرتے تھے۔ بعض مسافر اپنے بیوی بچوں کو بھی ساتھ رکھتے تھے۔ قافلہ جتنا چھوٹا ہوتا تھا، اس پر ناکوڑوں کے حملے کا اتنا ہی زیادہ خطرہ ہوتا تھا، اس لیے قافلے بہت بڑے ہوتے تھے۔ جن جن قافلے بڑھتے جاتے تھے ان میں مسافر شامل ہوتے جاتے تھے۔

اس کے مطابق ڈاکوؤں نے بھی اپنے گروہوں کی نفی بڑھال تھی۔ آگے چل کر سلطان صلاح الدین ایوبی کے دور میں صلیبیوں نے اپنے فوجی دستوں سے حاجیوں کے قافلوں کو ٹوٹنا شروع کر دیا تھا۔ معروف مؤرخ محمد قاسم فرشتہ نے بہت سے مؤرخوں کے حوالوں سے لکھا ہے کہ حماد بن علی نام کا ایک عرب سلطان محمود غزنوی کے دور کا طاقت ور رہزن تھا۔ اُس نے عرب ممالک کے پسماندہ قبائل میں سے اپنا ایک گروہ بنا رکھا تھا جو قافلوں کو ٹوٹا تھا۔ اس کا یہ گروہ ایک فوج جتنا جارہا تھا۔ وہ عرب ممالکوں میں حاجیوں کے قافلوں کو روکتا اور مال و دولت اور لوہاں لڑکیاں اڑا لے جاتا تھا۔ درمیان قافلے غزنی کے بھی ٹوٹے گئے تھے۔ محمود غزنوی کو اطلاع ملی تھی لیکن اُسے

”اب میں اپنی تجارت غزنی تک پھیلانا چاہتا ہوں۔“ حلوان بن علی نے کہا۔ ”وہاں سے مجھے خبر مل ہے کہ سیکڑوں آدمیوں کا قافلہ ج کے لیے آ رہا ہے۔ اس کی تعداد بڑھتی جائے گی۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس قافلے میں ہندوستان کی دولت آ رہی ہے۔ کیا یہ صحیح ہے کہ غزنی کا سلطان محمود ہندوستان کے غزائے خالی کر لایا ہے؟“

آ رہے ہیں۔ ہندوستان کا قیمتی سامان ان کے ساتھ آ رہا ہے جو ہماری منڈیوں میں فروخت ہوگا۔ قافلے کے ساتھ غزنی کے وہ تاجر بھی آ رہے ہیں جنہوں نے سلطان کی فوج سے سامان خریدا ہے۔ ایسا قافلہ اس سے پہلے میرے ہاتھ کبھی نہیں آیا تھا۔ اب میری کوجہ اسی قافلے پر مرکوز ہے۔ میں آپ کے پاس اس لیے آیا ہوں کہ آپ مجھے یقین دلائیں کہ میں اس قافلے پر ہاتھ ڈالوں تو خلیفہ میری گردن نہیں پکڑے گا۔ میں جانتا ہوں کہ خلیفہ سلطان محمود سے ڈرتا ہے۔

ہندوستان کی جنگیں اور اپنے مال کی خانہ جنگی ہملت نہیں دیتی تھی کہ لڑکھوؤں کے انداد کے لیے کچھ کرتا۔ اس کے علاوہ غزنی کے قافلے عرب کے دور دراز علاقوں میں لوٹے گئے تھے جو سلطان محمود کی دسترس سے باہر تھے۔ فرشتہ نے اُس دور کی تحریروں کی شہادت پر لکھا ہے کہ سلطان محمود کے دور میں القادر باللہ عباسی خلیفہ تھا اور خلافت کی گدی کے لئے ابدا میں تھی۔ خلافت اب امتدار کی گدی بن کر رہ گئی تھی۔ القادر باللہ ایک علاقے کا حکمران بھی تھا جس کے دفاع اور توسیع کے لیے وہ کوشاں رہتا تھا۔ اس کی یہ کوشش ویر پروردہ ہوئی تھیں۔ امتدار پرستی اور شہنشاہیت کے لیے جھوٹ اور لرزب ضروری ہوتا ہے، چنانچہ خلیفہ بعض سازشوں کا خالق تھا۔ سلطان محمود کے ساتھ بھی اس کی ایک ٹکڑ بھجی تھی۔ مورخ لکھتے ہیں کہ خلیفہ القادر باللہ کو معلوم تھا کہ عرب کے بعض قبائل جو بد کہلاتے ہیں، حماد بن علی کی قیادت میں تغلب کو لوٹتے ہیں لیکن خلیفہ دانستہ نہگا ہں پھرے ہوئے تھا۔

اسی دنوں جب ہر علاقے میں حاجیوں کے قافلے تیار ہو رہے تھے، بغداد میں حماد بن علی خلیفہ کے ایک سالار کے گھر میں بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ دو بڑی حین لڑکیاں تھیں جو کچھ دیر وہاں خاموش بیٹھی رہیں۔ سالار انہیں دیکھتا اور مسکراتا رہا۔ ان لڑکیوں کے علاوہ حماد بن علی کچھ اور بچے بھی لایا تھا۔ تھوڑی دیر بعد لڑکیاں اور بچے کسی اور کمرے میں چلے گئے۔ سالار اور حماد ایک ملے رہ گئے۔

”خلیفہ کے مزاج کیسے ہیں؟“ حماد نے پوچھا۔ ”مجھ کا موسم آ رہا ہے۔“

”خلیفہ کے مزاج پہلے کی طرح میرے ہی ہاتھ میں ہیں۔“ سالار نے

جواب دیا۔ ”مجھے معلوم تھا جج سے پہلے تم آؤ گے۔ ہمارا حصہ ہمیں مل جائے۔“

خلیفہ کی پرواہ نہ کرو۔ اُسے خلافت کی گدھی سے پیار ہے اور اُسے ایسے

میشروں اور درباریوں کی ضرورت ہے جو اسے یقین دلاتے رہیں کہ وصاری

دنیا کا بادشاہ ہے اور اُس کی رعایا اس سے بہت خوش ہے۔ یہ کام اہم

ہے اور سنا ہے کہ وہ حج کے لیے جانے والوں اور حج سے واپس آنے والوں کا بہت احترام کرتا ہے اور انہیں ہر طرح کی سہولت دیتا ہے۔
 ”اب تو میں بھی فوج اکٹھی کر سکتا ہوں۔“ حماد بن علی نے کہا۔ ”تمام قبیلے میرے زیر اثر ہیں۔ میں سات آٹھ سو نفری بڑی آسانی سے آؤں گا۔ کیا آپ ان قبیلوں سے واقف نہیں؟ ... اور پھر میں آسنے سامنے آکر لاکڑ کرکھڑے ہی لڑوں گا۔ میں گھات لگاؤں گا۔“
 ”کسی سپاہی علاقے میں؟“ سلار نے جواب دیا۔

”نہیں۔ کبہ کے رگستان میں۔“ حماد نے جواب دیا۔ ”آپ کیسے سلار ہیں؟ کیا آپ رگستان کی گھات نہیں جانتے؟ جب قافلے پر اچانک حملہ ہو گا تو قافلے والے ادھر ادھر بھاگیں گے۔ انہیں پھینے کی کوئی جگہ نہیں ملے گی۔ میں کبہ کے رگستان سے واقف ہوں۔ ایک علاقہ ریتیلے ٹیلوں کا ہے۔ اس کی بھول بھلیوں سے صرف ہمارے قبیلے واقف ہیں۔ کوئی اجنبی ان میں پھنس جائے تو اسے باہر پھینے کا راستہ نہیں ملتا۔ اس علاقہ میں غزنی کی فوج بھی نہیں لاسکتی۔ میرے ساتھ جو قبائلی ہیں وہ انسان نہیں جن میں آپ مجھے خلیفہ سے ملادیں۔ اس کی خدمت میں بھی کچھ پیش کر دوں۔“

خلیفہ القادر باللہ عباسی اپنے خاص کمرے میں بیٹھا تھا اور اس کا سلار جو اس کا منظور نظر تھا اسے بتا رہا تھا کہ حماد بن علی اس سے ملنے آیا ہے۔ وہ تجھے جو حملہ لایا تھا، خلیفہ کے سامنے پڑے تھے۔ سلار نے حماد کی بہت تعریف کی اور خلیفہ کو بتایا کہ حماد بن علی بڑے کام کا آدمی ہے۔ وہ تمام سرکشی قبائل کو آپ کی خلافت کا غلام بنا رہا ہے اور آپ کے لیے وہ ان قبائل میں سے فوج تیار کر رہا ہے۔ جب کبھی ہمیں ضرورت پڑی ا یہ قبائل ہمارے دوست بدوش لڑیں گے۔“

”یہ قبائل سرکشی اور خود سر ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ قافلوں کو لوٹے ہیں اور

لڑکیاں بھی اٹھائے جاتے جنہیں وہ بیچ ڈالتے ہیں۔“
 ”یہ اُن لوگوں کا بہتان ہے جو حماد کی مقبولیت اور طاقت سے خوفزدہ ہیں اور حسد کرتے ہیں۔“ سلار نے چالوسی کا کمال دکھاتے ہوئے کہا۔ ”ہر وہ انسان جو لوگوں میں مقبول ہے وہ حاسدوں کے دل کا کٹنا بکھا جاتا ہے۔ آپ کے بھی دشمن ہیں۔ وہ جب دیکھتے ہیں کہ آپ کی رعایا آپ کا نام سن کر سجدہ ریز ہو جاتی ہے تو وہ جتنے اور کڑھتے ہیں۔ حماد بن علی نے تمام سرکشی قبائل کو اپنا سرید بنا رکھا ہے اور خود آپ کا سرید ہے۔ وہ تمام قبائل کو آپ کا سرید بنا چکا ہے۔“

”امیر المؤمنین! ایک اور درباری حاکم جو سالار کا ہی آدمی تھا، بول پڑا۔ اس عمر میں بھی آپ کا چہرہ مبارک جوانی کے خون سے دھک رہا ہے۔ حماد بن علی آپ کے لیے جو تحفہ لایا ہے، وہ آپ رات کو اپنے عرم میں دیکھ لیں گے۔“

”اور آپ اس تحفے کے قابل ہیں؟“ سلار نے کہا۔ ”آپ حماد کو صرف باریاں بخشیں۔ وہ باہر انتظار کر رہا ہے۔“

”اسے انتظار میں باہر کھڑا رکھا گیا ہے۔“ خلیفہ نے ساری دنیا کے بادشاہ کی طرح جلال سے لہجے میں کہا۔ ”ایسے آدمی کو ہم اپنے برابر بٹھائیں گے۔“

نور محمد بن علی کو حاضر کیا گیا۔ وہ وجہ عرب تھا۔ چہرہ لال اور سنکھین شمر جی رنگ کی تھیں۔ ادھیر عمر تھا لیکن لگتا جوان تھا۔ اس کے چہرے پر اُن عربوں کا جلال تھا جنہوں نے رومیوں اور زرتشتوں کو گھٹنوں بٹھادیا اور اسلام کا پرچم سمندر پار روپ میں جا گاڑا تھا۔ حماد کے بازو لیے اور کندھے سینے اور گودشت سے بھرے ہوئے تھے۔ وہ جب اندر آیا تھا تو اس کے قدموں کے نیچے زمین ہلٹی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اس کے ہونٹوں ہر قسم سے تھکا اور وہ مردانہ وقار کا شاہکار تھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک میں اس

کے چہرے کی دیک میں اور اُس کے ظاہری جاہ و جلال میں شائبہ تک نہ ملتا تھا کہ یہ شخص لیڈر اور قاتل ہے۔

خلیفہ اٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ حماد کی طرف بڑھا کر بولا ”آگے آؤ صاحب بن علی! خفا کی قسم، ہمیں ہمدے چہرے پر رکھا نظر آتا ہے کہ تم قصر خلافت کے پاسبان ہو۔ ٹوٹ مار کر لے والے دشمنی قبائل کو نگام ڈال کر تم نے خلافت پر اور اسلام پر عظیم احسان کیا ہے۔“

”میں آپ کی رعایا ہوں یا امیر المومنین! حماد نے کہا ”رعایا میں کون ایسا فرد ہے جو آپ کی عبادت نہیں کرتا؟ آپ لے ٹھیک فرمایا ہے کہ میں قصر خلافت کا پاسبان ہوں۔ میں اپنی جان اور عمرائی قبیلوں کی وفاداری پیش کرنے آیا ہوں۔“

خلیفہ نے حماد کو یوں لینے برابر بٹھالیا جیسے کسی نے سانپ اپنی آستین میں ڈال لیا ہو۔

یہ ۲۰-۱۱۹ء کا دور تھا جب سین اُنڈس کھلتا تھا اور دہاں اسلامی چیم لہار مٹا تھا مگر سرنگوں ہوتا جا رہا تھا۔ قریب ساڑھے نو سو سالوں کا اندازہ قدرت پرست پہلو والوں کا اکھڑا ہوا بن چکا تھا۔ طارق بن زیاد کی ہڈیاں خاک ہو چکی تھیں اور اُس کی روح اُس اُنڈس کے لیے تڑپ رہی تھی جسے فتح کر لے سکے ایسے اُس نے سمندر پار کر کے کشتیاں جلا ڈال تھیں تاکہ واپسی کا تصور ہی مٹ جائے۔ وہ اُنڈس، وہ طارق بن زیاد کا اُنڈس ویسے ہی چالیس مشیر مدد اور دباوی خوشامدیوں کی بھینٹ چر رہا تھا جیسے بغداد کے قصر خلافت میں بھی موجود تھے۔ اُن دنوں جب بغداد میں ایک لیڈر اور عمرائی قزاق خلیفہ کے دربار میں ایک معزز تاجر کے بہروپ میں پیش کیا گیا تھا، سین کے حکمران حیا کا بھتیجا اُس کے خلاف لڑ رہا تھا۔ یہ خانہ جنگی تھی۔ دہاں خلافت و جبر پکار رہی ہوئی تھی جو کوئی خلافت کی گدھی پر بیٹھ جاتا وہ برا اُس آدمی کو قتل کرانے کی درپردہ

کوشش کرتا تھا جس سے اُس کے اقتدار کو خطرہ ہوتا تھا۔ اس کے باوجود اُس کے خلاف سازشیں ہوتی تھیں۔

خوشامدیوں اور چالیسوں کا ایک ٹولہ تھا جو ہر خلیفہ کی مدد سرانی کرتا اور اُس پر غالب آ جاتا تھا۔ دشمن سلطنت اسلامیہ کی جڑوں میں اُتر کر اُسے چوہوں کی طرح کھا رہے تھے۔ غلاموں کے واسے نیارے تھے سناہل اور بدویانت لوگ عمدے اور رُتبے حاصل کرنے لگے اور جو عمدوں اور رُتبوں کے اہل تھے وہ مشتبہ، خزیب کار اور شریک کھلانے لگے۔ اہل قلم بھی اپنا ایمان اور صداقت نیلام کر بیٹھے اور لندس میں اسلام کا چراغ ٹھٹھانے لگا۔ ادھر خلافت بغداد بھی شخصی حکومت کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ وزیر اور مشیر مرخدا ہر سستی کے شکار ہو گئے، اور عمرائی قزاق معززین میں شمار ہونے لگے تھے۔ حماد بن علی ایسے ہی افراد میں سے تھا۔ ایک سلطان محمود غزنوی تھا جو اسلام کی مشعل اٹھا لے ہند کے بست خانے میں جان کی بازی لگائے ہوئے تھا۔ اسی لیے وہ اقتدار کے بھوکے لوگوں کے دلوں میں کاٹنے کی طرح کھٹکتا تھا۔

حماد بن علی کے ساتھ چار محافظ تھے جن میں ایک وجیہ ترک ازبگین تھا۔ وہ کوئی ایک سال پہلے حماد کے گروہ میں شامل ہوا تھا اور حماد کا قابل اعتماد محافظ بن گیا تھا۔

جس طرح ہر اسلامی مملکت میں جمع پہ جانے والوں کے قافلے تیار ہو رہے تھے، ایسا ایک قافلہ غزنی میں بھی تیار ہو رہا تھا۔ تیاری یہ تھی کہ قافلے میں زیادہ سے زیادہ لوگ شامل ہو جائیں تاکہ قزاقوں اور ہزنلوں سے محفوظ رہیں۔ قافلے میں تاجر بھی شامل ہو رہے تھے۔ مگرد و نواح کے لوگ بھی غزنی میں جمع ہو رہے تھے۔ اونٹوں گھوڑوں اور ہیلوں کی خرید و فروخت ہو رہی تھی۔ بیل اور گھوڑا گاڑیاں تیار ہو رہی تھیں۔ یہ سیلے کا

جاگ اُٹھے اور اُنسی کھلی جھجھکا بیٹھ جہاں رات رقص اور شراب کی محفل جمی تھی مگر آج رات وہاں کوئی رقص نہیں تھی۔ شراب پلانے والی عورتیں موجود تھیں۔

”میرے عزیز دوستو!۔۔۔ حماد بن علی نے سب سے مطالبہ ہو کر کہا۔۔۔“
 ”حاجیوں کے قافلے چلنے والے ہیں اور قافلوں کے قافلے چل بھی پڑے ہوں گے مگر اب بہت بڑا شکار آ رہا ہے۔ غزنی کا قافلہ ہے۔ اس کے ساتھ ہندوستان کا مال فینیت آ رہا ہے۔ تم نے اس سے پہلے غزنی کے قافلے مارے ہیں مگر اتنا مال ہاتھ نہیں آیا تھا۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ اب جو قافلہ آ رہا ہے وہ تین برسوں کے لیے مالامال کر دے گا مگر اس قافلے پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں ہوگا۔ قافلے میں ڈیڑھ ہزار سے زیادہ لوگ ہوں گے۔ سب مسلح ہوں گے اور ان میں فوجی بھی ہوں گے۔ اس قافلے پر چند ایک آدمیوں کا گروہ ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ ہم سب کو مل کر ایک فوج کی طرح حرکت کرنا ہوگا۔۔۔ کیا تم لوگ مجھے بتا سکتے ہو کہ ہر ایک کتنے آدمی اپنے ساتھ لاسکتا ہے؟“

”ایک ہزار۔“ ایک نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”چھ سو۔“ ایک اور نے کہا۔

”چار سو۔“

ہر ایک نے بتایا کہ وہ کتنے آدمی لاسکتا ہے۔ یہ تعداد پانچ ہزار بن گئی۔

”یہ یاد رکھو کہ ہمیں پانچ ہزار قزاق نہیں سپاہی درکار ہیں۔۔۔ حماد بن علی نے کہا۔“
 ”ہو سکتا ہے میں ایسی خدمت پیش نہ آئے لیکن میں باقاعدہ لڑائی کے لیے تیار رہنا چاہتا ہوں۔ میں لہذا سے آ رہا ہوں۔ مجھے خلیفہ کے ایک سالار نے بتایا ہے کہ غزنی کا سلطان اس کا نام محمود ہے، حاجیوں کی بہت عزت کرتا ہے اور ان کا بہت خیال رکھتا ہے۔ جو سکا ہے وہ اتنے بڑے قافلے کے ساتھ فوج کا ایک دستہ بھیج دے گا۔“

سر سردار نے پرجوش آواز میں حماد کو یقین دلایا کہ وہ اپنے ساتھ ایسے کھوارا رہے جو غزنی کی فوج کو کاٹ کر رکھ دیں گے۔

منظر تھا۔ اس میلے میں حماد بن علی کے آدمی بھی گھوم پھر رہے تھے۔ وہ جائزہ لے رہے تھے کہ قافلے کے ساتھ کتنا مال جا رہا ہے اور جو لوگ ساتھ جا رہے ہیں وہ مزاحمت کے قابل ہیں یا نہیں۔

قافلے کو ڈیڑھ ایک ماہ بعد روانہ ہونا تھا۔ عرب کے صحرائیں کہیں ایک نخلستان تھا۔ وسیع اور سرسبز۔ وہاں چمے لگے ہوئے تھے۔ مشعلیں جل رہی تھیں۔ غیوں کا ایک شہر آباد ہو گیا تھا۔ غیوں سے دربار سے سو سو آدمی گول دائرے میں زمین پر بیٹھے تھے۔ ایک جگہ قالمیں بکھے تھے۔ ان پر حماد بن علی بیٹھا تھا۔ وہاں بھی مشعلیں اور قندیلیں جل رہی تھیں۔ گول دائرے میں ایک رقصہ ناز رہی تھی تین چار خوبصورت اور جوان عورتیں حماد کے ساتھ بیٹھ ہوئے آدمیوں کو شراب پیش کر رہی تھیں۔ ان کے کندھے، سینے اور لہجہ بیٹھیں لگی تھیں۔ انہوں نے جو لیے فزاک ہیں رکھے تھے ان پر تارے سے چمک رہے تھے۔ ان عورتوں کی چال ایسی تھی جیسے ریت پر تیز رہی ہوں۔ ہماروں کے آگے سالم بکرے روست کر کے رکھے ہوئے تھے۔

رقصہ کار قاصد اس کے ساتھ صحرائی ساز و جہ آفریں تھے۔ رالف لیلہ کی ایک بڑی بی حسین اور پراسرار رات تھی۔ صحرایہ جھمکا گزرا گاہ سے بہت دور تھا۔ یہ حماد بن علی کی دنیا تھی اور اس دنیا میں جو ریت کے سمندر میں جہاز کی مانند تھی، اس کی بادشاہی تھی۔ اُس کے پاس بیٹھے ہوئے لوگ عرب کے سرکش اور ابراہیم قبائل کے سردار اور ہر کردہ لوگ تھے۔ ان کے انداز بتا رہے تھے کہ یہ کسی قاتلوں کے پابند نہیں اور ان کے دلوں میں خدا کا خوف بھی نہیں۔ اس محفل میں اتنی حسین لڑکیاں کہیں اور ہی جہاں کی مخلوق نہیں تھی۔

رات شراب اور عیاشی میں بستی، دوستی اور اُٹھ بکھر کر دہشت گردی گز گئی۔ سورج اُٹھتا تو یہ لوگ سگے، اور جب سورج صحرایہ کو جھلٹاتا تو اُٹھتا تو یہ پراسرار لوگ

دروختوں کے درمیان ایک انسانی سایہ آن رکھا۔ کوئی آدمی وہاں آن کھڑا ہوا تھا۔ سبیلہ نے ایک مردانہ چوڑے اُپر والا اونچے میں سے نکل کر بے پاؤں کھجور کے ان دو درختوں کی طرف چل پڑی۔

سایہ درختوں کے درمیان سے غائب ہو گیا۔ پھوڑی دیر بعد دوسرے کھجوروں کے سایہ سُنوں میں تحلیل ہو گئے۔ وہ اتر گئے۔ رات جب نفل برپا ہوئی تھی تو سبیلہ نے موقع دیکھ کر اتر گئے سے کڑ دیا تھا کہ رات وہ کھجور کے ان دو درختوں کے درمیان آجائے جو پانی کے کنارے الگ تھلگ کھڑے ہیں۔ اتر گئے اور سبیلہ کی آپس میں کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ وہ لوں جو ری چھپے ہوتے۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرایا کرتے تھے۔ دونوں کا ان قزاق قبائل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا، نہ وہ ان میں سے تھے۔ دونوں کو ایک قافلے سے اغوا کیا گیا تھا۔

سبیلہ غزنی کی فوج کے ایک شترسوار کی بیٹی تھی۔ اُس کا باپ صرف شترسوار ہی نہیں تھا، وہ سلطان محمود کا معتقد اور مرید تھا۔ وہ ہندوستان بھی اپنی فوج کے ساتھ گیا تھا۔ اپنے بچوں کو وہ سنایا کرتا تھا کہ اسلام ایک سچا اور عظیم مذہب ہے، جسے ساری دنیا میں پھیلانا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ وہ انہیں اسلام کی عسکری کہانیاں بھی سنایا کرتا تھا۔ یہ کہانیاں سبیلہ کے خون میں شامل ہو گئی تھیں مگر وہ بدہ تیرہ سال کی تھی جب اُس کا باپ ایک لڑائی میں مارا گیا۔ سبیلہ کی ماں نے اپنے خاندان کے ایک دوست کے ساتھ شادی کر لی۔ اُس کے پہلے بھی بچے تھے جن کے ساتھ اسے بہت پیار تھا۔ وہ اسی میں لگن رہا۔ سبیلہ اور اس کے چھوٹے دو بھائیوں کو وہ پیارا اور شفقت نہ دے سکا۔

سبیلہ کی عمر سو لہتر سال پہلے تو سو تیلے باپ نے اُسے خامی بڑی عمر کے ایک آدمی کے ساتھ بیاہ دیا۔ اس آدمی کی پہلے بھی دو بیویاں تھیں۔ سبیلہ کے سو تیلے باپ نے دراصل اس آدمی سے نقد رقم وصول کی تھی۔ سبیلہ کا خاوند بہتے والا درخت کوئی تھا۔ وہ شراب بھی پیتا تھا۔ اتر گئے اس آدمی کا خاص ملازم تھا۔ وہ چوک

”اگر تم واقعی سپاہی بن کر آؤ گے تو تمہیں ایک اور انعام ملے گا۔“ حماد بن علی نے کہا اُس کے پاس ایک بڑی ہی خوبصورت لڑکی بیٹھی تھی۔ یہ لڑکی ایک سال سے اُس کے پاس تھی۔ اُس نے لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا ”یہ غزنی کے حسن کا نمونہ ہے غزنی کے قافلے کے ساتھ ایسی بہت سی لڑکیاں آ رہی ہیں۔ پورے پورے کپڑے آ رہے ہیں۔ یہ ایسا انعام ہے جو تمہیں اور کہیں سے نہیں ملے گا۔“ لڑکی جو مسکرا رہی تھی، سنجیدہ ہو گئی اور اُس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ حماد بن علی سب کو بتانے لگا کہ قافلے پر کس مقام پر حملہ کرنا ہے۔ حماد کے چچے اس کلاباڈی کا رُز اتر گئے کھڑا تھا۔ وہاں محافظ کو ساتھ رکھنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن وہ ان قبائل کا بادشاہ تھا اور بادشاہ اپنے ساتھ محافظ رکھا کرتے تھے۔ جب حماد قبائل کے سرداروں سے مخاطب تھا، لڑکی نے نظریا کر اتر گئے کی طرف دیکھا۔ اتر گئے کا چہرہ بے تاثر تھا۔ لڑکی نے اُسے گھور کر دیکھا تو اتر گئے کے چہرے کا رنگ بدل گیا جیسے اُس سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہو۔

قبائلی سرداروں نے غزنی کے قافلے پر حملے کا منصوبہ کر لیا اور انہوں نے کیمہ کے رنگینان کو حملے کے لیے موندل کھجا۔

اُسی رات کا واقعہ ہے کہ حماد بن علی گہری نیند سو گیا تھا۔ دوسرے شخصے میں غزنی کی یہ لڑکی جس کا نام سبیلہ تھا، جاگ رہی تھی۔ اس کی نیند اُگنی تھی خیر گاہ پر سوت کا سکوت طاری تھا۔ ان لوگوں کو کوئی غم نہیں تھا۔ کوئی خطرہ نہیں تھا۔ انہیں پہرہ کھڑا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ رہزنی اور قزاقی ان کا پیشہ تھا۔ وہ وحشی تھے ان تک قانون کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا تھا۔

سبیلہ نے اُٹھ کر اپنے خیمے کا پردہ ذرا سا ہلایا اور باہر دیکھا۔ باہر تاریکی تھی۔ وہ کسی کے انتظار میں تھی۔ وہ پھر لیٹ گئی۔ کچھ دیر بعد پھر اُٹھی اور خیمے کا پردہ ہٹا کر دیکھا اور اُس کی نظریں ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے دو درختوں پر رک گئیں۔ ان کے پس منظر میں سادہ بھرا آسمان تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دونوں

شمسوار تھا، تیر انداز اور تیغ زن بھی تھا اس لیے آقا نے اُسے اپنا محافظ بھی بنا رکھا تھا۔ ارنگین ترک غلام تھا۔ اس کا بچپن احمد رنگین غلامی میں گزرا تھا۔ وہ جب جوانی میں داخل ہوا تو اُس کا قد بت اور چہرے کا حسن نکھر آیا۔ اُس کے ساتھ مالک نے اُس کی وجاہت سے متاثر ہو کر اسے گھوڑ سواری، تیر اندازی اور تیغ زنی سکھا کر اپنا محافظ بنایا تھا۔ اُس دور میں اپنے ساتھ ایک محافظ رکھنا بہت بڑا اعزاز سمجھا جاتا تھا۔

اس آقا کی موت کے بعد اسے ایک اور ایسے ہی دوست نے فرید لیا۔ اس آقا نے چند برسوں بعد ایک تاجر کی بیٹی کے ساتھ شادی کی اور اس کے عوض ارنگین اسے تحفے کے طور پر دے دیا۔ آخر میں وہ اس آدمی کے ہاتھ فروخت ہو کر اس کے ساتھ سبیلہ کی شادی ہوئی تھی۔ سبیلہ کا ارنگین کے ساتھ اتنا ہی تعلق تھا کہ وہ اس کے خاوند کا محافظ اور خاص ملازم تھا۔

ایک سال قبل سبیلہ کا خاوند ایک قافلے کے ساتھ کہیں جا رہا تھا کہ راستے میں ڈاکوؤں نے گھیر لیا۔ قافلے والوں نے مقابلہ کیا مگر انہوں نے ہتھیار ڈالنے میں دیر نہ کی۔ ارنگین ابھی تک قافلے میں ڈنٹا ہوا تھا۔ وہ گھوڑے پر سوار تھا۔ گھوڑے کو سر پیٹ دوڑا کر اور گھوم پھر کر روتا تھا۔ ڈاکوؤں کے سر مارنے ملان کیا کہ اس شخص کو زندہ پکڑو۔

قافلے والے دل چھوڑ بیٹھے تھے۔ ارنگین اکیلا لڑ رہا تھا۔ آخر ڈاکوؤں نے اس کے گھوڑے کو زخمی کر کے ارنگین کو گر لایا اور اسے پکڑ لیا۔ ڈاکوؤں کے ہاتھ قافلے کا تمام تر مال لگا اور دو بڑے قسمی انسان۔ ایک ارنگین تھا اور دوسری سبیلہ۔ سبیلہ کی نصیبی یہ تھی کہ وہ بہت خوبصورت تھی۔ وہ عورت تھی۔ روتی ہوئی ڈاکوؤں کے ساتھ چل پڑی، البتہ ارنگین کو ساتھ لے جانا مشکل ہو گیا۔ وہ ڈاکوؤں کو لٹکارتا تھا کہ دو دو آدمی باری باری اس کے مقابلے میں آئیں مگر اس کے ہاتھ پاؤں رسیوں سے باندھ کر اُسے ایک گھوڑے پر بٹھا دیا گیا۔ سبیلہ کا خاوند مارا گیا تھا۔

چند دنوں کی مسافت کے بعد ارنگین اور سبیلہ کو کسی جگہ حماد بن علی کے سامنے پیش کیا گیا۔ ڈاکوؤں کا یہ گروہ اُس کا تھا۔ سبیلہ پر تو خاموشی طاری تھی، ارنگین حماد کو کبھی لٹکارتا تھا۔ حماد چرب زبان تھا۔ اُس نے ارنگین کو موم کر لیا اور جب ارنگین نے اُسے بتایا کہ وہ غلاموں کے خاندان کا فرد ہے اور تین آقاؤں کا محافظ رہا ہے تو حماد نے اسے اپنے پاس بٹھالیا۔

”یہاں تم کسی کے غلام نہیں ہو۔ حماد بن علی نے کہا۔ ”یہاں تم بادشاہ ہو، سلطان ہو۔ تمہاری وجاہت دیکھ کر اور یہ سن کر کہ تم میرے اتنے زیادہ آدمیوں کے ہاتھ نہیں آتے تھے، میں نے تمہیں اپنے ساتھ رکھنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ تمہاری قدر میرے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔“

”کیا تم مجھے اپنے جیسا ڈاکو بنانا چاہتے ہو؟“ ارنگین نے خٹکیں بھریں پوچھا۔

”تو کی تم غلام رہنا چاہتے ہو؟“ حماد نے کہا۔ ”کیا تم آزادی کی زندگی پسند نہیں کر دو گے؟“

حماد نے اُسے قائل کر لیا کہ وہ اُس کے ساتھ رہے۔ حماد کو جب پتہ چلا کہ وہ اس لڑکی سبیلہ کے خاوند کا محافظ تھا جسے اُس کا گروہ اغوا کر لیا تھا تو اُس نے سبیلہ سے کہا۔ ”اگر تم یہاں ملکہ بن کے رہنا چاہتی ہو تو اپنے خاوند کے محافظ سے کہو کہ وہ تمہارے ساتھ رہے، ورنہ تم دونوں کا انجام بہت بُرا ہو گا۔“

سبیلہ نے ارنگین کو الگ لے جا کر کہا کہ وہ اُس کی خاطر اُس کے ساتھ ہے۔ سبیلہ نے اُسے بتلایا کہ حماد نے اُسے کیا دھمکی دی ہے۔ ارنگین حماد کا قائل ہو کر چکا تھا، سبیلہ کے مظلوم آنسوؤں نے اُس سے فیصلہ کر دیا کہ وہ حماد کے ساتھ رہے گا۔ حماد نے اُسے بہترین گھوڑا دیا اور اُسے اپنا ذاتی محافظ بنالیا۔ سبیلہ حماد کی داشتہ بن گئی۔ دونوں ایک سال کے عرصے میں اس ماحول میں گھل مل گئے تھے۔ ارنگین رہزنی کی دو دروازوں میں شریک ہوا تھا۔ وہ چونکہ حماد کا محافظ تھا

”یہی بتانے کے لیے ہمیں یہاں بلایا ہے کہ میں جاگ اٹھی ہوں۔“ سبیلہ نے کہا۔ ”وہ سبیلہ جاگ اٹھی ہے جو غزنی کی فوج کے ایک شہسوار کی بیٹی تھی۔ یہ بیٹی اس معذ گشتی تھی جس روز اس کی ماں نے اپنے بھائی کو خاوند کی موت کے بعد ایک ایسے آدمی کے ساتھ شادی کر لی تھی جو بجا نہیں تھا پھر یہ بیٹی بک گئی۔ تمہارے آقا کے ہاتھ۔ میں نے اس بیٹی کا گلا گھونٹ دیا تھا۔“

”عورت اور غلام کی لوحِ تقدیر پر یہی لکھا ہوتا ہے۔“ ارنگین نے کہا۔ ”تم نے بھی اپنی قسمت دیکھ لی ہے۔ میں نے بھی اپنی تقدیر کا لکھا دیکھ لیا ہے لیکن مجھے اس کا کوئی افسوس نہیں۔ میں غلام پیدا ہوا تھا۔ قبیلے کے ساتھ خانہ بدوشی میں مل کر جوان ہوا اور ہاتھوں ہاتھ بکتا رہا۔ میں نے صرف ایک بار سنا تھا کہ اسلام کسی انسان کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ کسی انسان کو اپنا غلام بنا سکے۔ میں سنس پڑا تھا کیونکہ انسانوں کو غلام رکھنے والے مسلمان ہی تھے۔“ وہ گنا بگھارتے ہوئے سبیلہ لے کر آیا۔ ”اسلام کی نگاہ میں کسی کو غلام رکھنا گناہ ہے۔ میری شادی تمہارے آقا سے ہوئی تو یہ بھی گناہ تھا۔ یہ شادی نہیں تھی۔ یہ سودا ہوا تھا۔ مجھے بیگیا تھا۔ میں شروع کے چند دن اس پر ہی پھر اپنے آپ کو سنبھال لیا کہ یہ تو عورت کی قسمت ہی ایسی کھلی گئی ہے۔ میں نے اپنے آپ کو مار لیا اور میں خوش رہنے لگی۔ تم نے مجھے ہنستے بھی دیکھا تھا مگر میرا جسم تھا جو زور اور ریشمی کپڑوں سے سجا ہوا تھا، اور یہ میرا من تھا جس نے مجھے فروخت کر لیا تھا۔ میری روح روتی تھی۔“

”تمہاری شادی کسی تم جیسے جوان اور خوبصورت کے ساتھ ہونی چاہیے تھی۔“ ارنگین نے کہا۔

”میں اپنی شادی کا رونا نہیں رو رہی۔“ سبیلہ نے کہا۔ ”جب میرا باپ زندہ تھا تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میری شادی ہوگی۔ باپ نے میرے لڑکپن میں یہ ڈال دیا تھا کہ میں مسلمان ہوں اور کفر کو جان اور مال کی قربانی دے کر ختم کرنا میرا فرض ہے۔ کبھی کبھی مجھے یوں لگتا تھا جیسے ہندوستان کے بُت خانے

اس لیے وہ فرائی میں کم ہی شامل ہوتا تھا۔ بدوؤں کے یہ قبائل اتنے سرکش تھے کہ اپنے اپنے سردار کے سوا کسی اور کا حکم نہیں ملتے تھے۔ حماد بن علی کو سب نے صرف اس لیے اپنا بے تاج بادشاہ تسلیم کر لیا تھا کہ اس نے خلیفہ بغداد کو اور ہر اس حاکم کو جو حماد کو گرفتار کر سکتا تھا، اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ خلیفہ کو تو بتایا ہی نہیں گیا تھا کہ حماد ہزن اور قراق ہے۔

اس ایک سال کے دوران ارنگین اور سبیلہ کی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ ارنگین اس کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ دونوں کو ایک دوسرے سے یہی لگاؤ تھا کہ دونوں اغوا ہوئے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دونوں نے اس زندگی کو پسند کر لیا ہے۔ سبیلہ کو حماد نے ملکہ بنا دیا تھا اور ارنگین کے ساتھ حماد کا یہ وعدہ پورا ہو گیا تھا کہ وہ یہاں غلام نہیں آزاد ہوگا۔ بدوؤں کا احترام کرتے تھے۔ اس رات جب سبیلہ ارنگین سے ملنے گئی تو یہ پہلی غصیہ ملاقات تھی۔ ارنگین حیران تھا کہ سبیلہ نے اسے یوں چوری چھپے کیوں بلایا ہے۔ کیا وہ اپنے آقا کے ساتھ بے وفائی کرنا چاہتی ہے؟ کیا اس نے درپردہ تعلقات کے لیے ارنگین کو منتخب کیا ہے؟

”کیوں سبیلہ؟“ ارنگین نے بڑھرا دھرونیہ کر پوچھا۔ ”ایسی کیا بات ہے کہ تم نے مجھے دن کے وقت اپنے خیمے میں بلانے کی بجائے رات کے اس وقت یہاں بلایا ہے؟“

”میں نے نہیں اپنے مرے ہوئے خاوند کا غلام سمجھ کر نہیں بلایا۔“ سبیلہ لے کر کہا۔ ”اپنے آپ کو نہ میرا غلام سمجھو نہ حماد بن علی کا... میں تمہارے سینے میں ایک انسان کو بیدار کرنا چاہتی ہوں۔ ایسا انسان جو کسی کا غلام نہیں ہوتا۔ وہ اپنے خدا کا اور اپنے مذہب کا اور اپنے وطن کا غلام ہوتا ہے۔“ ”کیسی باتیں کر رہی ہو سبیلہ؟“ ارنگین نے بھیگی سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے تم خواب دیکھ رہی ہو۔“

کے لیے لائی تھی۔ تم نہیں جانتے کہ اپنے خاوند سے کچھ کیسی سیودہ ہیں
سنائی پڑی تھیں۔“

”مجھے یاد ہے سبیلہ۔“ ارنگین نے کہا۔ ”آقا نے مجھے بھی بہت کچھ
کہا تھا اور اُس نے یہاں تک کہا تھا کہ تمہاری اور سبیلہ کی ایک دوسرے میں
یہ کبھی ختم ہو جانی چاہیے، ورنہ تم جانتے ہو کہ غلاموں کی سزا کیا ہے
... میں ان قزاقوں کے ساتھ خوش ہوں سبیلہ! یہاں مجھے کوئی غلام نہیں کتا۔
اگر تم کسی تکلیف میں ہو تو تم نے میرے ساتھ جو نیکیاں کی ہیں، ان کا صلہ دینے
کے لیے اپنی جان بھی قربان کر دوں گا۔“

سبیلہ کچھ دیر چپ چاپ رہی اور ارنگین کو دیکھتی رہی۔ صبح کی وہ رات
بھی چپ چاپ تھی۔ خیمہ گاہ میں جیسے لاشیں پڑی تھیں صحرانی لٹوڑیاں بھی سو
گئی تھیں مگر سبیلہ کے سینے سے بگولے اٹھ رہے تھے۔
”کو سبیلہ!“ ارنگین نے کہا۔ ”چپ کیوں ہو گئی ہو۔ اپنے غلام کو
آزماؤ۔“

”سوچ رہی ہوں کہ تم میری بات سمجھ بھی سکو گے یا نہیں۔“ سبیلہ نے
آہ لے کر کہا۔ ”کہہ دیتی ہوں۔ سن لو.... مجھے اپنی ذات کے لیے کچھ نہیں
چاہیے۔ کوئی صلہ نہیں چاہیے۔ تم نے حاد بن علی کی باتیں غور سے سنی تھیں
جو وہ بدوؤں کے سرداروں سے کہہ رہا تھا! وہ غزنی کے حاجیل کے قافلے
کو ٹوٹنا چاہتا ہے۔“

”کیا تم سے روک سکتی ہو؟۔“ ارنگین نے کہا۔ ”کیا تم نے ابھی تک غزنی
کو دل سے اتارا نہیں؟“

”اتار دیا تھا۔“ سبیلہ نے کہا۔ ”میں غزنی کی آبرو میرے خون میں موجود ہے۔
حماد جب غزنی کا قافلہ ٹوٹنے کی باتیں کر رہا تھا تو میں نے کچھ بھی محسوس نہ کیا مگر
جب اُس نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ یہ غزنی کے حُسن کا نمونہ ہے اور یہ

مجھے لگا رہا ہے۔ میرا باپ دوسرے ہندوستان گیا تھا۔ وہ کھڑستان کے قلعوں
کی تفریح میں شریک تھا۔ اُس نے دیوتاؤں کے بت ٹوٹتے دیکھے تھے۔ اُس نے
بُت خانوں میں اذانیں سنی تھیں۔ میرا باپ اُن مجاہدین اسلام میں سے تھا جن کی
عمر میدانِ جہاد میں گزر جاتی ہے۔۔۔ میری رگوں میں اس باپ کا خون بہے۔“
”سبیلہ!“ ارنگین نے کہا۔ ”کہا تم بھول گئی ہو کہ ہم دونوں کہاں بیٹھے
ہیں؟ کسی نے دیکھ لیا تو حلالِ دم دونوں کو ہاتھ پاؤں بالمدھ کر صحران میں پھینک
دے گا۔ صحران کی موت کو تصور میں لا سکتی ہو؟.... مجھے جلدی جلدی بتاؤ کہ
آج رات تم اپنے ماضی کو کیوں یاد کر رہی ہو۔ اگر تم نے اپنا سن مار لیا تھا تو
اسے زندہ کیوں کر رہی ہو؟ یہ زخموں کوٹ نہیں سکتیں جن میں تم اب جکڑی گئی
ہو۔ میں تو دیکھ رہا تھا کہ تم یہاں خوش ہو۔“

”ہاں ارنگین!“ سبیلہ نے کہا۔ ”میں یہاں خوش تھی۔ اگر لہان صرف
گوشت اور ہڈیوں کا مجسمہ ہے تو میں یہاں بہت خوش تھی مگر رات میرا مجسمہ
مر گیا ہے اور روح زندہ ہو گئی ہے۔ قزاق کی دانشہ مر گئی ہے اور بجاہل بیٹی
زندہ ہو گئی ہے۔۔۔ اب میں نہیں بیدار کرنے آئی ہوں۔ مجھے تمہاری مدد کی
ضرورت ہے۔“

”کیا میں نہیں یہاں سے بھاگ لے جاؤں؟۔“ ارنگین نے پوچھا۔
”بڑا مشکل کام ہے۔“

”نہیں۔“ سبیلہ نے کہا۔ ”میں یہاں سے نہیں بھاگوں گی۔ تم بھاگ جاؤ
... سنو ارنگین! جب تم میرے خاوند کے محافظ اور غلام تھے تو میرا ہتھارے
ساتھ کیا سلوک تھا۔ تمہیں یاد ہے ایک بار میرا خاوند تمہیں کہیں بھیج رہا تھا اور
تم بیمار تھے مگر میرا خاوند کہہ رہا تھا کہ تم خواہ راستے میں مر جاؤ تمہیں جانا پڑے
گا۔ اُس وقت میں نے تمہیں پچایا تھا۔ میں خاوند سے لڑ پڑی تھی کہ وہ تمہیں
اس حالت میں اتنے لمبے سفر پر بھیج رہا تھا کہ تم اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے
کے قابل نہیں تھے۔ میں نے تمہیں رکوایا تھا اور میں طبیب کو تمہارے علاج

اٹھا اور ایسے لٹکا کر کبھی نہیں ہاتھ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا ہو....
 مجھے آواز سی سنائی دی۔ 'اُس آواز' شخص کو قتل کر کے نہ تم نندہ رہ سکتی
 ہو نہ ان بددلوں سے غزنی کے قافلے میں آنے والی بیٹیوں کو بچا سکتی ہو۔
 صبح یہ وحشی اور درندے اپنے بادشاہ کے خون کا جواستقام تم سے لیں گے
 ایسے تصور میں لاؤ۔ میرا ہاتھ رک گیا۔ میں نے سوچا۔ بہت سوچا۔ میں کوئی عزم
 نہیں کر رہی تھی اس لیے عقل میرا ساتھ دے رہی تھی۔ مجھ پر آگیا کہ میں نے
 تمہیں بلارکھا ہے۔ تم سے بات کر کے کچھ کرواؤ گی.... اگر لگیں! غزنی کی بیٹیاں
 قزاقوں کی دانتا میں نہیں بنیں گی۔ سلطان محمود قزاقی اور لیر انہیں۔ میں ان بیٹیوں
 کی آبرو بچانے کے لیے کفارہ ادا کروں گی۔"

”اس کے باوجود تم چلے جاؤ۔“ سہید نے کہا۔ ”ہمیں خطرہ تو سول لینا
 ہی ہو گا.... تم ڈر رہے ہو۔ تمہارا ڈر بجا ہے۔ تمہاری کوئی بیٹی نہیں۔ تمہاری

”اے!“۔ سید نے کہا۔ ”میرے سینے میں انتقام کا شعلہ بھڑک اٹھا تھا اور اُس وقت خدا کے بعد صرف تم تھے جس کی طرف میں دیکھ سکتی تھی مگر تمہارا چہرہ بتا رہا تھا کہ تم نے کچھ بھی محسوس نہیں کیا۔ میں نے اُسی وقت سوچ لیا تھا کہ تمہیں سنائی نہیں ملاؤ گی اور تمہارے دل میں بھی اُس سہی کی آبرو کا احساس بیدار کروں گی جس نے تمہیں جنم دیا تھا۔۔۔۔۔ میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ میں بے بس اور مجبور ہوں اور قرآنِ فیصلوں کے اس بادشاہ کا میں کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی میں نے یہ چوٹ برداشت کرنے کا بھی ارادہ کیا تھا مگر جلاو کے فیصے میں جا کر اس نے مجھے بدست اور مخمور لگا ہوں سے دیکھا اور جب میں لے اس کے جسم کی پیش محسوس کی تو میرے سینے کے شعلے بھر بھر کر اُٹھے۔“

انہی خاموش تھا جسے وہ کچھ سن ہی نہ رہا ہو۔

”سن رہے ہو انگوٹھیں؟“

”سن رہا ہوں“ — ارنگین نے کہا — ”تمہارے انتقام کے شعلے
 بے بس اور تجبور ہیں۔“

محمد نے کہا۔ 'سید! سنا ہے غزنی کا سلطان محمود اپنے آپ کو
 محبت شکن کہلاتا ہے۔ اُس نے قلعہ لگا کر کہا۔ 'محمود مجھ جیسا لڑا ہے۔
 ڈاکو زن ہے۔ میں کسی روز اس بت شکن کا بت توڑ دوں گا۔' یہ سن کر
 میرا خون کھول اٹھتا وہ جب گہری نیند سو گیا تو میں نے اُس کا خنجر نکال لیا۔

نہیں رک سکے، کڑاؤں کو روکا جاسکتا ہے۔ فوج کو ساتھ بھینا در نہ غزلی کی بیٹیاں
باہل اور بغداد کے بازاروں میں یک جا بیٹھ گئی۔ سلطان سے کہنا کہ قافلے سے ایک
بھی بیٹی اغوا ہو گئی تو خدا سلطان کو کبھی نہیں بخنے گا۔

”میں کڑے دوں گا۔“ ارنگین نے کہا۔ ”میں کڑے دوں گا۔ دعا کرو کہ میں زندہ
دہاں پہنچ جاؤں، مگر تم یہاں سے نہیں نکلو گے! میں تمہیں اس درندے
کے پاس چھوڑ کر کس طرح جانسوں گا؟“

”تم چلے جاؤ ارنگین! تم چلے جاؤ۔“ سبیلہ نے جذبات سے لرزتی آواز
میں کہا۔ ”اگر زندہ رہی تو باقی عمر ستاری غلام رہو گی۔ میرے جسم اور میری روح
کے ملک صرف تم ہو گے، پھر تم نہیں میں غلام ہو گی۔ تم غزلی پہنچ جاؤ گے۔
تم کوئی گناہ نہیں کر رہے۔ خدا تمہارے ساتھ ہے۔“

”کیا تم ان لوگوں کو کسی طرح میرے تعاقب سے روک سکتی ہو؟“
”کوشش کروں گی۔“ سبیلہ نے کہا۔ ”میں نے ان لوگوں سے بہت کچھ
سیکھ لیا ہے۔ تمہیں اپنا آقا یاد ہے نا جو میرا خاوند تھا۔ اس کی بیویوں کو تم
بھی جانتے تھے اور تم یہ بھی جانتے تھے کہ میرے خاوند کی محل عیسیٰ حلیٰ میں کبھی
کیسی سارنٹیں ہوتی تھیں۔ جہاں دولت اور عورت ہو، وہاں سے مخلص اور
شرارت رخصت ہو جاتی ہے۔ میں شیطان کی اس دنیا کا ایک حصہ بنی رہی ہوں۔
میں ہر شیطان کا کم کر سکتی ہوں تم یہاں کے ایک سردار کو قتل کو جانتے ہو گے
جس نے کہا تھا کہ وہ ایک ہزار ی اپنے ساتھ لائے گا۔ مجھے اس شخص سے
نفرت ہے۔ اس نے مجھے کہا تھا کہ میں حماد کی بیوی نہیں پھر بھی اُسے دھوکہ نہیں دوں گی۔
اُس نے مجھے لالچ دیئے تھے اور پھر دھکی دی کھتی کہ وہ مجھے اغوا کر لے گا۔ اُس
نے یہ بھی کہا تھا کہ میں نے اگر حماد کو بتا دیا تو وہ مجھے قتل کر دے گا میں شاید
اس سے انتقام لوں گی تم یہاں کی باتیں چھوڑو ارنگین! اس وقت کب یہاں سے نکلو گے۔“
”ابھی“۔ ارنگین نے کہا۔ ”اب مجھ سے اور کچھ نہ پوچھو۔ تم چلی جاؤ۔“

کوئی بہن نہیں۔ میں ستاری بہن ہوں تو تم میری عزت پر مڑ بیٹے۔ ارنگین غزلی
کی سٹی ستاری بیٹی ہے۔ ستاری بہن اور ستاری ماں ہے۔ میں جانتی ہوں کہ بہن
مٹی نے تمہیں کچھ نہیں دیا۔ تمہیں وہاں غلام سمجھا گیا۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ
جس ملک کے حکمران اپنی رعایا کو بھوکا اور تنگ رکھتے ہیں اور اُسے ان حقوق سے
محروم رکھتے ہیں جو انسان کو خدا نے دیئے ہیں تو ان انسانوں کے دلوں سے
اپنے وطن اور اپنے مذہب کی محبت نکل جاتی ہے۔ وہاں بھائی بھائی کا دشمن ہو
جاتا ہے

”میں تمہیں یقین دلائی ہوں کہ تم سلطان محمود کے پاس پہنچ سگے اور اُسے
یہ بتایا کہ تم غلام تھے تو وہ تمہیں گلے لگا لے گا۔“ سبیلہ نے کہا۔ ”پھر تم غلام
نہیں رہو گے۔ تم سلطان کی نگاہ میں اور خدا کی نگاہ میں بھی قابل احترام انسان
بن جاؤ گے۔ اپنے آپ میں عزت پیدا کرنا ارنگین! اپنے وطن اور اپنے مذہب کی
بیٹیاں وطن کی آبرو دہوتی ہیں۔ وہ قومیں ذلیل و خوار ہوتی ہیں جو اپنی بیٹیوں کی
ناموس کو فراموش کر دیتی ہیں۔“

”میں ستاری ایک بات بھی نہیں سمجھ سکا سبیلہ!“۔ ارنگین نے کہا۔
”میرے دل میں کسی نے وطن کی محبت پیدا ہی نہیں کی۔ مجھے نوکری کرنی ہے۔
اسی لیے ایک قزاق کے پاس بھی گھسے ہوں لیکن تم جو کہو گی کروں گا۔ تم مظلوم ہو
پھر بھی تمہارا ایمان محفوظ ہے۔ میں کہہ چکا ہوں کہ ستاری نیکیوں کا صلہ ضرور
دوں گا۔ کہو، مجھے کیا کرنا ہے؟“

”یہاں سے ۲۰ طرح نکلو کسی کو پتہ نہ چلے۔“ سبیلہ نے کہا۔ ”تم راستے
سے واقف ہو۔ پناہ۔ ہر دوں میں غزلی پہنچ جاؤ گے۔ اگر غزلی کے حاجیوں کا
تبادلہ وہاں سے چل پڑا ہو تو اُسے روک لینا اور میرا دواں کو تباہ دینا کہ راستے میں
کیا خطرہ ہے۔ اُسے کہنا کہ تم فوج کا انتظام کرنے جا رہے ہو۔ اگر قافلہ ابھی وہیں
ہو تو سلطان محمود کے پاس چلے جانا اور اُسے بتانا کہ قافلے پر باغی ہزار بدو حملوں
کے۔ سلطان سے یہ ضرور کہہ دینا کہ قوم کی ایک بیٹی لے پیغام بھیجے کہ جہانکے قافلے

رات کا آخری پہر گزرا رہا ہے۔ سبیلہ نے اُس کا ایک ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر آنکھوں سے لگایا پھر جُڑا اور وہاں سے اپنے خیمے میں آگئی۔

خیمہ گاد میں وہی سکوت تھا جو پہلے تھا۔ ان لوگوں کو جاگنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ ارنگین ان کے بے تاج بادشاہ کا خاص محافظ تھا۔ اُسے خیمہ گاہ میں گھومتے پھرتے، کوئی گھوڑا یا اونٹ کھولتے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ جس خیمے میں کھائے پیئے کا سامان پڑا تھا وہاں سے کچھ اٹھانے بھی اسے کوئی لوگ نہیں سکتا تھا۔ اُس نے جب دیکھا کہ سبیلہ اپنے خیمے میں بیچ گئی ہوگی، وہ اپنے خیمے میں گیا۔ برہمن، تلوار، کمان اور ترکش اٹھائی، کچھ کپڑے لیے۔ سفری تھیلے اٹھائے اور رسد والے خیمے میں چلا گیا۔ وہاں سے پانی کے مشکیزے اور کھانے کا سامان اٹھایا اور ایک اونٹ جا کھولا۔ سلمان اس کے ساتھ باندھا اور اس پر سوار ہو کر اُسے اٹھایا۔

سبیلہ اپنے خیمے میں پر وہ مذاہنا کر دیکھ رہی تھی۔ اسے خیمہ سیاہ دھیریں کی طرح نظر آرہے تھے۔ اُس کا دل دھڑک رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اُسے خیموں سے دور ایک اونٹ کا ہیولہ اس طرح نظر آیا جیسے اونٹ ہلق کی نیکر پر چلا جا رہا ہو۔ سبیلہ کے ہونٹوں سے دعا سرگوشیاں بن کے نکلتی گئی اور اونٹ کا ہیولہ پھوٹنا ہوتا گیا، دور ہٹا گیا پھر وہ اُس کے آنسوؤں کی دھند میں چھپ گیا۔ سبیلہ بستر پر جا گری اور اُس کی آنکھ لگ گئی۔

اُس کی جب آنکھ کھلی، آدھا دن گزر گیا تھا۔ وہ اُٹھ بیٹھی۔ اُسے رات کی بات یاد آئی تو اُسے خوف سا محسوس ہوا جیسے ارنگین اُسے دھوکہ دے کر جادو کو بتا دے گا۔ وہ خیمے سے نکلی۔ ارنگین کے خیمے کا پردہ اٹھایا وہ وہاں نہیں تھا۔ اُس کے ہتھیار اور اُس کے کپڑے بھی وہاں نہیں تھے۔ سبیلہ ارنگین کے خیمے سے نکل رہی تھی تو جادو اپنے خیمے سے باہر آیا۔ اُس نے سبیلہ کو اپنے پاس بلا کر پوچھا کہ وہ ارنگین کے خیمے میں کیا لینے گئی تھی۔

سبیلہ نے اپنے چہرے پر کھراہٹ کا تاثر پیدا کر کے کہا۔ ”میں ارنگین کو دیکھنے گئی تھی کہ وہ وہاں ہے یا نہیں مجھے ڈر ہے کہ وہ زندہ نہیں ہے۔ وہ قتل ہو چکا ہے۔“

”قتل؟“ حماد بن علی نے پوچھا۔ ”تمہارا دماغ ٹھکانے معلوم نہیں ہوتا۔ یہاں کون کسی کو قتل کر سکتا ہے؟“

”گوگیل“ سبیلہ نے کہا۔ ”گوگیل نے ارنگین کو غائب کر دیا ہے۔ اب میری باری ہے۔ میں نے آپ کو پہلے نہیں بتایا تھا۔ آپ جب مجھے یہاں لائے تھے تو گوگیل نے مجھے لایج اور دھکیاں دے کر سنوانے کی کوشش کی تھی کہ میں آپ سے بھاگ کر اُس کے پاس چلی جاؤں۔ میں نے اسے کہا تھا کہ میں اپنے آٹا کو دھوکہ نہیں دوں گی۔ اس کے بعد وہ اب آیا ہے۔ گذشتہ رات میں آپ کے ساتھ آپ کے خیمے میں گئی تھی۔ آپ سو گئے تو میں وہاں سے نکل کر اپنے خیمے میں جانے کی بجائے ٹپٹے ٹپٹے پانی تک چلی گئی۔ گوگیل شاید میرا پیچھا کر رہا تھا۔ وہ میرے پاس آگیا اور مجھے دغلائے گا۔ میں نے اسے ٹالنا چاہا تو اس نے مجھ پر دست درازی کی۔ میں اپنے آپ کو اگلی سمجھ رہی تھی لیکن اچانک ارنگین آگیا۔ وہ مجھے بتائے بغیر میری حفاظت کے لیے مجھ سے کچھ دور موجود رہا۔“

”گوگیل نے اُسے آپ کا غلام سمجھ کر نکالیا دیں اور وہاں سے چلے جانے کو کہا۔ ارنگین نے اُسے بڑی ذہیری سے کہا کہ وہ اپنے آٹا کی عزت پر جان قربان کر دے گا۔ گوگیل نے اُسے کہا کہ یہ رات تمہاری زندگی کی آخری رات ہے۔ جاؤ۔ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو اپنے آٹا کے خیمے میں سنا وہ چلا گیا۔ ارنگین مجھے میرے خیمے میں چھوڑ کر چلا گیا۔ میں طاعنی ہوں کہ گوگیل زندہ ہے۔ اُس نے رات کو ارنگین کو غائب کر دیا ہے۔“

حماد بن علی غصے سے پھڑپھڑانے لگا اور اُس نے زین کو دیکھا۔

”میں جانتا ہوں کہ تم قبیلے کے سردار ہو۔“ حماد بن علی نے گوگیل سے کہا۔ ”لیکن تم بھول گئے ہو کہ میں کون ہوں... میں تمہیں بخش دوں گا۔“ میرا آدمی مجھے واپس کر دیا۔

”کون سا آدمی؟“ گوگیل نے حیران ہو کر پوچھا۔

”ارتگین۔“ حماد نے کہا۔ ”میرا محافظ جو گندہ شہ رات بتا رہا ہے اور سبیلہ کے دربار میں آگیا تھا۔“

گوگیل حیران و پریشان ہو گیا۔ سبیلہ نے حماد سے کہا کہ یہ شخص اپنا جرم چھپانے کے لیے ابنان بن رہا ہے۔

گوگیل ابنان بن علی لے آئے کہا ”کیا تم ایک غلام اور ایک دانش کی خاطر مجھ سے دشمنی مول لے رہے ہو؟ اس وقت میں اتحاد اور اتفاق کی ضرورت ہے۔ میں تمہیں اس جیسی دس لڑکیاں لا دوں گا مگر تم نے میری دانش پرست دلائل کر کے میرے محافظ کو غائب کر دیا ہے۔ کیا تم قبیلے کے سردار ہو؟ کیا تم مجھ سے ٹکرے کر سردار رہ سکو گے؟ زخمہ رہ سکو گے؟“

بات بڑھ گئی، چونکہ گوگیل نے ارتگین کو غائب نہیں کیا تھا اس لیے وہ آگ بگولہ ہو رہا تھا۔ حماد نے تمام سرداروں کو اکٹھا کر لیا اور سبیلہ سے کہا کہ وہ سب کو سنا لے کہ گوگیل نے کیا کیا ہے۔ سبیلہ نے وہی بات سادی جو وہ حماد کو سنا چکی تھی گوگیل غصے سے اٹھا اور یہ کہہ کر چل پڑا۔ ”میرا آدمی میرے قبیلے کا بتا رہا ہے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔“

اُس نے پیٹھ پھیری ہی تھی کہ حماد نے اپنے قریب کھڑے ایک آدمی کی کمان ل اڈنا اُس کی کرکٹ سے تیز نکال کر کمان میں ڈالا۔ دوسرے لمحے تیرگوگیل کی بیٹھ ہیں اُترا ہوا تھا اور نہ ریت پر نہ پڑ رہا تھا۔ اسی روز حماد نے ایک خاتمہ قریب منعقد کر کے گوگیل کے قبیلے کا ایک اور سردار مقرر کر دیا۔ اس لیے سب سے کہا کہ میں جانتا تھا کہ مجھے میرا محافظ واپس نہیں ملے گا۔ گوگیل نے اسے یقیناً قتل کروا کے اس کی لاش کمبیں دبا دی ہے۔

اُس وقت تک ارتگین بہت دور چل گیا تھا۔ صبح طلوع ہونے تک وہ اونٹ کو دوڑاتا رہا تھا۔ سورج اُبھرا تو اُس نے اونٹ کی رفتار کم کر دی۔ اُس نے گھوم گھوم کے دیکھا۔ اُس کے تعاقب میں کوئی نہیں آ رہا تھا۔

حماد بن علی نے قبائلی سرداروں کو آخری ہدایات دیں اور انہیں کید کے صحرائے قریب ایک جگہ بتا کر کہا کہ وہ اپنے آدمیوں کو وہاں جمع کریں۔ اسی روز سب اپنے اپنے کبیلوں کو روانہ ہو گئے اور حماد بھی وہاں سے چلا گیا۔ وہ جب اپنے ٹھکانے پر پہنچا تو اُس کا ایک اور جاسوس غزنی سے آیا جس نے اُسے بتایا کہ غزنی کے قافلے کی نفری اور زیادہ بڑھ گئی ہے اور اس میں مالدار تاجروں کی خاصی تعداد ہے۔ اُس نے حماد کو یہ بھی بتایا کہ راستے میں لوگ اس قافلے کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس طرح یہ قافلہ اور زیادہ بڑا ہو جائے گا۔ اس جاسوس کو کوئی ایسے آثار نہیں ملے تھے کہ قافلے کی حفاظت کے لیے فوج کا کوئی انتظام ہو گیا ہو۔

”میں جہاز تک فوج کا دستہ کیسے بھیج سکتا ہوں۔“ غزنی میں سلطان محمود غزنوی قافلے کے ایک وفد سے کہہ رہا تھا۔ ”قوم کے ہر فرد کو سپاہی ہونا چاہیئے۔“ قافلے کا ایک وفد احمد قاسم فرشتہ کی تحریر کے مطابق (سلطان ٹٹو کے پاس یہ درخواست لے کر گیا تھا کہ قافلہ بہت بڑا ہے اور اس کے ساتھ خواتین اور بچے بھی ہیں اور تاجروں کا قیمتی مال بھی ساتھ جا رہا ہے اس لیے قافلے کی حفاظت کے لیے فوج کا ایک دستہ ساتھ ہونا چاہیئے۔

”میں بے خبر نہیں کہ حاجیوں کے قافلے رہزنوں اور قزاقوں کے ہاتھوں لٹتے رہتے ہیں۔“ سلطان ٹٹو نے کہا۔ ”میں حج پر جانے والوں کو ہر سہولت اور مدد دیا کرتا ہوں مگر یہ ممکن نظر نہیں آتا کہ میں مکہ معظمہ تک فوج قافلے کے ساتھ بھیجوں۔ اتنے بڑے قافلے میں بے شمار آدمی ایسے ہوں گے جو لڑ سکتے ہیں اور شہسوار بھی ہیں۔ قافلے میں سپاہی بھی حج کو جا رہے ہیں۔ آپ لوگ پوری طرح مسلح ہو کر جائیں۔ تیرو کمان ساتھ رکھیں۔ مجھے اتنے

بھی کہتا ہے کہ حاجیوں کے قافلے کو روکے رکھو۔ سلطان محمود حاجیوں کے نام پر ضروری کام بھی چھوڑ دیا کرتا تھا۔ اُس نے ارنگین کو فوراً بلالیا۔ وہ تو زندہ لاش بن چکا تھا۔ سبز کھلا ہوا اور آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ وہ کھڑا رہنے کے قابل نہیں تھا۔ اُسے سہارا دے کر بٹھایا گیا۔ میشریب پلاٹے گئے، کچھ کھلایا گیا تو وہ ہوش میں آنے لگا۔ وہ اچانک اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے میں بڑبڑاتے ہوئے نکل گیا۔

”سلطان غزنی و خراسان سے گستاخی کی معافی چاہتا ہوں۔“ ارنگین نے کہا۔ ”ایک ہینڈ ہو گیا ہے، میں پاؤں پر نہیں چلا۔ پہلے اونٹ پر سوار رہا اور جب پیادگی علاقہ آیا تو ایک سوار سے ٹھوڑا پھینک کر اونٹ اُسے دے دید راستے میں دو اور سواروں سے گھوڑے چھینے اور تھکن اور سبھوک سے آدھ ٹوٹے گھوڑے اُن کے پاس پھوڑے۔ گھوڑے کی بیٹھ پر کھاتا بیٹا رہا اور کم گھوڑے کو دیکھ کر نہ چلنے دیا ورنہ ڈیڑھ ماہ کی مسافت ایک ماہ میں طے نہ ہوتی۔“

وہ بات کیا ہے جو تمہیں اس حالی میں میرے پاس لائی ہے؟۔ سلطان محمود نے پوچھا۔

”اگر آپ حجاز کے قافلے کے ساتھ فوج کے دو دستے نہیں بھیج سکتے تو قافلے کو غزنی سے باہر نہ نکلنے دینا۔“ ارنگین نے کہا۔ ”کید کے گھر میں قافلے کو ٹوٹنے کے لیے قزاقوں کا وہ گروہ بلکہ وہ فوج حیدر زں سے جسے خلیفہ بغداد کی پشت پناہی حاصل ہے۔“

خلیفہ بغداد کی پشت پناہی؟

”اگر سلطان غزنی کو ایک علامہ کی بات پسند نہیں آئی تو غلام جان بخشی چاہتا ہے۔“ ارنگین نے کہا۔ ”اگر خلیفہ کی پشت پناہی نہیں تو اُس کے سالاروں اور حاکموں کی مدد حاصل ہوگی۔ اگر یہ بھی نہیں تو اسے جھوٹ نہ سمجھنا کہ تمام بد وقتیلے ایک شخص حماد علی کی قیادت میں غزنی کے قافلے

بڑے قافلے پر حملے کا کوئی خطرہ نظر نہیں آتا۔ قافلے وہ لٹتے ہیں جن میں مسافر بہت کم ہوتے ہیں۔ آپ لوگ بے خوف ہو کر جائیں۔“

جب وہ فوج چلا گیا تو سلطان محمود نے اپنے مشیروں اور سالاروں کی ایک محفل میں کہا۔ میں نے ان لوگوں کو بالواس کیا ہے۔ یہ فریضہ راج ادا کرنے جا رہے ہیں۔ مجھے ان کی درخواست مان لینا چاہیے تھی لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہمیں فوج کی کتنی زیادہ ضرورت ہے۔ یہاں کے حالات ٹھیک نہیں۔ سرحدوں پر ہر وقت خطرہ موجود رہتا ہے۔ ابھی دو تین دن گزریے ہندوستان سے تشویشناک خبریں آئی ہیں۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ قنوج کا مہاراجہ راجا پال جو دہلی سے بھاگ گیا تھا، ہمارے قلعہ دہلی کے پاس گیا اور اُس نے ہماری قسملط تسلیم کرنے کا معاہدہ کیا اور قنوج سے کچھ دھڑ اپنی نئی راجدھانی بنانے کی اجازت مانگی ہے۔ میں اُس سے تادان اور باج وصول کروں گا اور اُسے نئی راجدھانی بنانے کی اجازت دے دوں گا مگر دہلی کے زمین ہمارا ہے، کالینڈر گواہی دلا دلا سہارا راجا پال کے دشمن بن گئے ہیں۔ قنوج سے پیغام آیا ہے کہ یہ مہاراجہ ہمارا راجدھانی کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کر رہے ہیں اور انہوں نے ہمیں فیصلہ کن شکست دینے کے لیے متحدہ میاں بنالیا ہے۔ معلوم نہیں کب ہمیں ہندوستان کو کوچ کرنا پڑے گا۔“

”نافرمان ہونے والا تھا۔ سلطان محمود کے پاس جو وفد گیا تھا اس کے ارکان نے قافلے کے تمام مسافروں سے بکڑ دیا تھا کہ وہ مسلح ہو کر چلیں۔ ہتھیار اکٹھے کرنے کے لیے قافلے کی روانگی ایک دو دنوں کے لیے ملتوی ہو گئی۔“

اور اُس وقت سلطان محمود کو اطلاع دی گئی کہ ارنگین نام کا ایک آدمی بڑی بڑی حالت میں آیا ہے۔ کہتا ہے بہت دُور سے آیا ہوں اور یہ

کو کید کے صحرا میں اُس جگہ جہاں ٹیلے زیادہ ہیں، ٹوٹ لیس گئے اور لڑکیوں کو اٹھالے جائیں گے۔ حماد بن علی ہندو گیا تھا۔ میں چونکہ اس کے ساتھ تھا اس لیے میں یقین کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ وہ پہلے خلیفہ کے ایک سالار اور دو بڑے حاکموں سے ملا تھا، پھر وہ اسے خلیفہ کے پاس لے گئے تھے۔“

ارتھین نے سلطان محمود کو تفصیل سے بتایا کہ حماد بن علی نے کس طرح اور کہاں بدو قبائل کے سرداروں کو اکٹھا کیا اور قافلے پر حملے کا منصوبہ طے کیا ہے۔ قزاقوں کی تعداد پانچ ہزار ہوگی۔

”پانچ ہزار“۔ سلطان محمود حیرت زدہ ہو گیا۔

”اسی زیادہ تعداد کی وجہ یہ ہے کہ حماد بن علی کے جاسوسوں نے جو یہاں آکر قافلے کی نیاری دیکھ گئے ہیں، وہاں جا کرتا ہے کہ قافلے میں ہندوستان سے آئے ہوئے مال جا رہا ہے اور قافلے میں زیادہ تر لوگ فوجی ہیں یا لڑنے والے ہیں۔“

ارتھین نے کہا: ”قافلے کی فہمی ڈیڑھ ہزار بتائی گئی ہے۔“

”قافلے میں کون فوجی نہیں ہے۔“ سلطان محمود نے کہا: ”اگر لو جیوں

کو جج کی فرصت ہوتی تو سب سے پہلے میں جاتا۔ وہ گہری جستج میں

کھو گیا اور بولا: ”میں جہاز کے قافلے کو نہیں روک سکتا۔ اگر میں خود جہاز

جا نہیں سکتا تو جانے والوں کے جان و مال کی حفاظت میرے فرائض میں

ہے۔ میں حاجیوں کی سلامتی کی خاطر سلطنتِ غزنی کی سلامتی خطرے میں ڈال

سکتا ہوں۔“ وہ بولتے بولتے رُک گیا اور اُس نے ارتھین کو بڑی غور سے

دیکھتے ہوئے پوچھا: ”لیکن میں نے تم سے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ تم ہو کون

اور تم جو قزاقوں کے سرغنہ کے خاص آدمی ہو، دل میں ہمارے قافلے

کی ہمدردی کس طرح لے کر آئے ہو؟ کیا تم اللہ کے اس سپاہی کو دھوکہ

دے سکو گے جس کے نام سے ہندوستان کے دیوتاؤں کے بت کانپ

جاتے ہیں؟“

”غزنی کی ایک بیٹی جو بہت بڑے دھوکے کا شکار ہے، غزنی کی بیٹیوں کے لیے کفارہ ادا کرنا چاہتی ہے۔“ ارتھین نے کہا۔ ”وہ آبرو باختہ غزنی کی آبرو کو بچانے کے لیے اپنے سلطان کو بیکار رہی ہے۔ میں ایک غلام ہوں، ابنِ غلام ہوں، ترک ہوں لیکن جسمِ غزنی کی مٹی میں لیا ہے۔ اس لڑکی نے جس کا نام سبیلہ ہے اور جس کا باپ آپ کی فوج میں خستہ سوار تھا اور شہید ہو گیا ہے، مجھ جیسے غلام کے دل میں غزنی کی مٹی کی عظمت پیدا کر دی ہے۔ اگر سلطانِ عالی مقام کا دل بہت مضبوط ہے تو نہیں۔“

ارتھین نے اپنا ماضی اور پھر سبیلہ کی زندگی کی کہانی سلطان محمود کو سنا دی اور اُسے تفصیل سے سنایا کہ سبیلہ نے اُسے کس طرح غزنی آنے کے لیے تیار کیا تھا۔ سلطان محمود کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

”جس قوم کی بیٹیاں اس بجموری کی حالت میں بھی اپنے ایمان اور کردار کو مرنے نہ دیں اس قوم کو کوئی شکست نہیں دے سکتا۔“ سلطان محمود نے

کہا اور اپنے سامنے بیٹھے ہوئے حاکموں وغیرہ سے مخاطب ہو کر کہا: ”تم اپنی

اُبھرتی ہوئی نسل کو گناہوں میں ڈبو دو لیکن روایاتِ جہنم میں شامل ہو گئی

میں وہ ایک نہ ایک دن رنگ لائیں گی۔“ اور تم نے سلطان نے ارتھین

کی طرف ہاتھ کر کے کہا: ”تم غلام نہیں ہو۔ آگے آؤ۔“ وہ آگے آیا تو سلطان

نے اُسے گلے لگا لیا اور بولا: ”ہم سب غلام ہیں۔۔۔۔ اللہ کے رسول کے

غلام اور یہی مسلمان کی عظمت ہے۔“ سلطان نے پرسش آواز میں کہا:۔

”قافلہ جانے لگا اور اس کے ساتھ فوج بھی جائے گی۔ غزنی کی سرحدوں

پر ہمارا خطِ نظر رکھے گا۔“

یہ توجہ بات کی بات تھی کہ سلطان محمود نے کہہ دیا کہ فوج جانے گی

لیکن اُس نے فوج کو کبھی جذباتی کیفیت میں استعمال نہیں کیا تھا۔ اُس

نے دو سالاروں اور مشیروں کو بلایا۔ غزنی کی سرحدوں کی اندرونی حالات

ہیں اللہ ان کا محافظ ہو۔

انگلیں قاضی القضاۃ کے ساتھ ساتھ جارہا تھا۔

کید کے صحرا میں ایک وسیع خطہ ایسا تھا جہاں صحرائی ٹیلے دیوانوں اور عمارتوں کی طرح کھڑے تھے۔ ان میں بعض ٹیلے ستونوں کی شکل کے تھے اور بعض ڈراولے ڈراولے سے۔ ان میں سے راستہ گذرتا تھا۔ یہ جگہ بہت ہی خطرناک تھی۔ بھول بھلیاں تھیں۔

اس سے ذرا پرے حماد بن علی نے کیمپ لگا رکھا تھا۔ یہ کم و بیش چار ہزار بدوؤں کی خیمہ گاہ تھی۔ وہ غزنی کے قافلے کو لوٹنے کے لیے آگئے تھے۔ وہ لڑاکے تھے، شہسوار تھے اور نڈر تھے۔ ان کا کوئی مذہب نہیں تھا۔ وہ اپنے قبیلے کے سردار کو ہی قابل عبادت سمجھتے تھے اور ان سے بڑا سرداروں کے سردار کو سمجھتے تھے جو اس وقت حماد بن علی تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ سرداروں کے سردار پر نہ پیر اثر کرتا ہے نہ کوئی اور ہتھیار۔ قزاقی کو وہ جائز پیشہ سمجھتے تھے۔ ان کی نگاہ میں یہ کوئی مذموم حرکت نہیں تھی۔

حماد بن علی کے ساتھ سبیلہ بھی تھی۔ وہ بظاہر خوش تھی لیکن اندر سے کھولی کھولی رہتی تھی۔ وہ قافلے کے انتظار میں بے تاب تھی۔ اور اس وقت تو وہ اندر سے کانپنے لگی جب رات کے وقت ایک بدو نے اگر حماد کو بتایا کہ قافلہ بہت بڑا ہے اور اس کے پیچھے پیچھے فوج بھی آ رہی ہے۔ بدو نے یہ بھی بتایا کہ قافلہ کوئی ایک کوس دھڑانے ہوئے ہے۔

حماد بن علی اس خطے کو جو دنیا کی نظروں سے اوجھل تھا، اپنی زمین سمجھتا تھا جیسے وہاں ہوا میں بھی اسی کے حکم سے چلتی ہوں۔ اس نے کچھ بھل کا کوئی انتظام نہ کیا۔ قاضی القضاۃ نے رات کو ہی کمانڈروں سے صلاح مشورہ کر کے ٹیلوں کے علاقے میں موزوں بلندیوں پر تیرا انداز

کی اور ہندوستان سے آنے والے بیانات کی صورت حال پر بات چیت کی اور جانرو لیا کہ قزاقوں کی تعداد اگر پانچ ہزار ہے تو فوج کی کتنی نفری ساتھ لے جانی چاہیے۔ سلطان محمود نے کہا کہ بدو گھوڑے اور اونٹ دھڑاتے ہوئے لڑتے ہیں اور وہ بھاگنے کا راستہ بھی صاف رکھتے ہیں، اس لیے قافلے کے ساتھ چھاپہ مار دستہ اور ایک دستہ تیراندازوں کا بھیجا جائے۔

اس وقت کی کسی بھی تحریر سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ فیصلہ کیوں کیا گیا کہ جو دستہ قافلے کے ساتھ بھیجے گئے ان کی قیادت کسی سالار کی بجائے قاضی القضاۃ ابو محمد کو دی گئی۔ محمد قاسم فرشتہ نے مختلف مورخوں اور اپنی تحقیق کے حوالوں سے یہ تین نام۔ حماد بن علی، انگلیں اور قاضی القضاۃ ابو محمد۔ دونوں سے لکھے ہیں۔ قاضی القضاۃ کی حیثیت آج کے چیف جسٹس کی جی جی جی۔ مذہبی امور کے فیصلے بھی وہی کرتا تھا۔ اس قدر میں قاضی فہر حرب دھڑب کی بھارت بھی رکھتے تھے۔

فرشتہ لکھتا ہے۔ سلطان محمود نے قاضی القضاۃ ابو محمد کو فاضی فوج دے کر قافلے کے ساتھ بھیجا۔ سلطان محمود نے ابو محمد کو تیس ہزار درہم اس مقصد کے لیے دیئے کہ لڑائی کی بجائے یہ نرم قزاقوں کو دے کر ان سے معاہدہ کر لیا جائے کہ قافلے کو خیریت سے جانے دیں... سلطان کا یہ انتظام دیکھ کر قافلے میں کمی ہزار لوگ شامل ہو گئے۔

اور قافلہ روانہ ہو گیا۔ قافلے کو الوداع کہنے کے لیے سلطان محمود خود گھوڑے پر سوار دھڑتک۔ ساتھ گیا۔ وہ قافلہ کی ٹیل لبا تھا۔ سلطان ادھر ادھر گھوڑا دھڑاتا اور مسکراتا اور مسکراتے ہوئے سب کو ہاتھ ہلاتا اور خیریت سے دایس آئیںک دیتا جارہا تھا۔ پھر وہ ایک بلند جگہ جا کھڑا ہوا اور اس وقت وہاں سے اُتر آج قافلے کا آخری مسافر اس کے سامنے سے گزر گیا۔ وہ بہت دیر تک جاتے ہوئے قافلے کو دیکھتا رہا۔ آخر اس کی آنکھ کھلی اور اس نے کہا۔ "خوش نصیب ہیں جو حجاز کو جا رہے

بٹھا سیٹے اور حماد کی خیر گاہ کا جائزہ بھی لے لیا لیکن اُس نے سلطان محمود کی ہدایات کے مطابق حملے میں پہل کرنے کی بجائے دوستانہ معاہدہ بہتر سمجھا۔ رات بھر فوج بیدار رہی۔

ادھر بد قبال حملے کے لیے تیار ہو گئے۔ صبح طلوع ہوئی تو غزنی کی فوج کے دو آدمی حملوں میں مل کے پاس گئے اور اُسے قاضی القضاۃ کا پیغام دیا کہ تم لوگ قافلے کو گھرنے دو۔ اس کے عوض تمہیں پانچ ہزار درہم ادا کئے جائیں گے۔

حماد بھرک اٹھا اور غصے سے ہتھوک اڑاتے ہوئے بولا۔ ”پانچ ہزار درہم.... پانچ ہزار درہم سے تم میرے پاؤں کی خاک بھی نہیں خرید سکتے۔ تم میری توہین کرنے آئے ہو۔ میں بھکاری نہیں ہوں۔ اُس نے بد قبالوں کے خیموں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”اپنے قاضی سے جا کر کہو کہ میری طاقت دیکھو۔ کیا میں انہیں ایک ایک درہم دے کر واپس لے جاؤں؟ تہلکے سے قافلے کی ساری دولت میری ہے۔ تمام مال و دولت اور میری پسند کی تمام جوان عورتیں میرے حوالے کر دو اور قافلہ خیریت سے گزر جائے۔“

”حماد بن علی! ایک پیغامبر نے کہا ”طاقت پر اتنا غور نہ کر۔ فرعون نہ بن۔ ہم و زواج است لے کر نہیں آئے۔ دوستی کا ماتھ بڑھانے آئے ہیں۔ قافلہ مال و دولت اور خواہن سمیت یہاں سے خیریت سے گزرے گا لیکن یہ ریت تیرے قزاقوں کے خون سے لال ہو جائے گی۔“

”جیلے جاؤ یہاں سے۔“ حماد نے گرج کر کہا۔ ”میں اپنے خیمے میں آئے ہوں یہاں کو قتل نہیں کیا کرتا۔ جاؤ۔“

پیغامبر واپس آ رہے تھے تو انہیں ارنگین مل گیا۔ اُس نے پوچھا کہ حماد نے کیا جواب دیا ہے۔ اُسے جب بتایا گیا تو وہ ہنس پڑا اور تیر و کمان کندھے سے ہٹا کر ایک ہندی پر کھڑا ہوا۔

قاضی القضاۃ کو سلطان محمود نے تیس ہزار درہم دیئے تھے لیکن اُس نے یہ رقم ضائع کرنی مناسب نہ سمجھی۔ اُس نے یہ مانتے ہوئے کہ اتنا بڑا اتفاق پانچ ہزار درہم کی پیش کش کو اپنی توہین سمجھے گا، یہی پیشکش کی جو دراصل جیلج تھا کہ حماد آؤ اور قافلے پر حملہ کرو۔ قاضی القضاۃ ابو محمد نے اپنی پیشکش کا جواب سن کر اس نے فوج کو سونوں مقامات پر کر دیا۔ فوج کی نفری تھوڑی تھی۔

حماد بن علی نے غصے کی حالت میں بد قبالوں کو اکٹھا کیا اور ٹیلوں کے باہر باہر سے انہیں پیش قدمی کر کے قافلہ پر حملے کا حکم دیا۔ قافلہ ٹیلوں کے باہر تھا۔ حماد گھوڑے پر سوار ساتھ ساتھ ساتھ تھا۔ اس کے ساتھ ایک طلبہ دار تھا۔ علم ساد رنگ کا تھا۔ ساتھ دو محافظ تھے۔ ادھر قافلے میں آئے والے کچھ لوگ تھے۔ وہ گھوڑوں اور اونٹوں پر سوار ہو گئے۔ عورتیں ہاتھ بند کر کے دعائیں مانگنے لگیں۔ بد قبالوں کے کالے اور کرخت چہرے بڑے ڈر اُنے تھے۔ اور دُعا ایک ٹیلے پر سیدھ کھڑی تھی۔

ارنگین ہندی سے اتر کر ٹیلوں کے اندر چلا گیا اور اونٹنیوں کی ادت میں اُس طرف نکل گیا جدھر سے بد قبالوں کی فوج جا رہی تھی۔ ان کے گھوڑوں اور اونٹوں کی چال میں کئی تھی۔ ارنگین چھپ کر دیکھتا رہا۔ پھر اسے حماد بن علی نظر آیا۔ وہ بہت دُور نہیں تھا۔ ارنگین نے اپنی کمانچ، تیر ڈالا اور حماد کے چہرے کا نشانہ لے کر تیر چھوڑ دیا۔ تیر حماد کی نینبی میں اتر گیا۔ وہ تیر دیکھ کر گھوڑے سے گر پڑا۔ اُس کے محافظ ابھی دیکھ ہی رہے تھے کہ یہ کیا ہوا ہے کہ ایک تیر طلبہ دار کی گردن میں دائیں سے لگا اور بائیں کو نکل گیا۔ یہ تیر بھی ارنگین کا تھا۔ پریم گر پڑا۔

ارنگین دوڑ کر ٹیلے پر چڑھا اور بڑی ہی ہند آواز سے چلانے لگا۔ ”خدا کی قسم! میں نے حماد بن علی کو مار ڈالا ہے۔... غزنی کی آبرو کی قسم، ہندس کا پریم گر پڑا ہے۔“

اپنے سرداروں کے سردار کو اور اپنے علم کو گرتا دیکھ کر قبائلیوں میں
 بھڑک اٹھی۔ تب قاضی القضاۃ ابو محمد نے فوج کو حمد کا حکم دے دیا۔ اتر گئیں
 نے اُسے پہلے بتا دیا تھا کہ وہ حماد کو پہچانتا ہے اور وہ سب سے پہلے
 اسے مارنے کی کوشش کرے گا۔ ابو محمد نے اسے کہا تھا کہ اگر وہ اسے
 حملے سے پہلے مارے تو لداکار کو آواز دے۔ خدا نے ان کا یہ منصوبہ کامیاب
 کر دیا۔

اس کے بعد جو کچھ نبوات بمذہبوں کا قتل عام تھا۔ وہ اب اپنے آپ کو
 پہچانے کے لیے لڑ رہے تھے اور اس کوشش میں وہ ٹیلوں کے اندر آ گئے
 جہاں وہ سمجھتے تھے کہ چھپ سکیں گے مگر ابو محمد نے وہاں پہلے ہی ٹیلوں پر
 تیر انداز بھارا کھینچے۔ ان میں سے جو بدتر باہر کو بھاگے انہیں تعاقب
 کر کے ختم کیا گیا۔

اس خاک و خون میں ٹیلوں کے اندر گھوڑوں کے شور اور زخمیوں کی
 چیخ و پکار میں ایک نسوانی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ”اڑتگین... اڑتگین“
 یہ سبیلہ کی پکار تھی۔ اسے غزنی کا ایک سوار اٹھا کر گھوڑے پر نہ ڈال
 لیتا تو وہ گھوڑوں تلے روندی جاتی۔

دو پہر تک کیمہ کا موکر ختم ہو چکا تھا۔ اس سے آگے قافلے کے ساتھ
 فوج کا چھوٹا سا ایک محافظ دستہ بھیجا گیا۔ قاضی القضاۃ باقی فوج کو واپس غزنی
 لے گیا۔ اس کے ساتھ بمذہبوں کے بے شمار گھوڑے اور اونٹ تھے جن
 پر ان کے خیمے اور دیگر سامان لدا ہوا تھا۔

”اڑتگین!“ ابو محمد نے راستے میں اسے کہا۔ ”تم غلام نہیں ہو اور
 تم سبیلہ غزنی کی نہیں اسلام کی آبرو ہو۔ اسلام زندہ رہے گا۔“